ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

ماہنامہ

محدث

لاہور پاکستان

مدیر اعلیٰ

حافظ ڈاکٹر عبدالرحمن مدنی

مدیر

ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

384 | اگست 2019

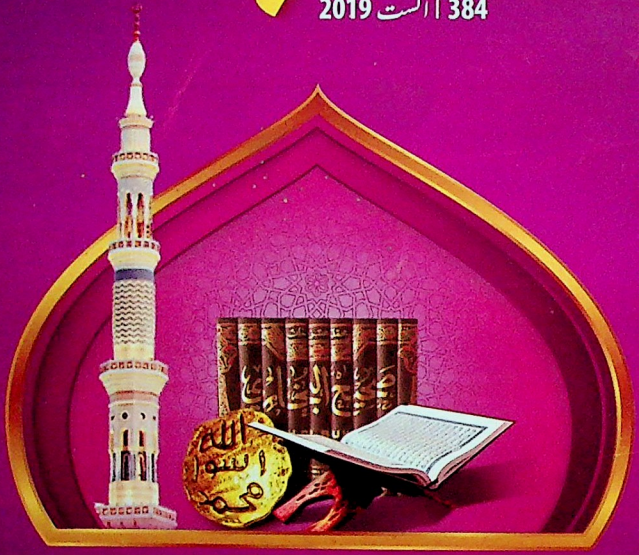

4 مغرب کے انسانی حقوق کے کرشمے!

36 آلِ سعود اور عثمانی سلاطین کا تقابلی مطالعہ

54 امام مالک اور موطا؛ ایک تعارف

73 آدابِ اختلاف اور دعوتِ دین ②

جامعہ لاہور الاسلامیہ

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

مجلس التحقیق الاسلامی

علوم وفنون، افکار ونظریات اور تنظیموں وتحریکوں کے مرکز 'لاہور' میں عظیم الشان لائبریری

المکتبۃ الرحمانیۃ

اساتذہ، محققین اور اعلیٰ تعلیم کے طلبہ کی علمی ضروریات کا اہم مرکز ومرجع

خصوصیات

- ہمہ نوعیت کے موضوع پر 45 ہزار علمی و دینی کتابیں
- بین الاقوامی DDC لائبریری سکیم کے تحت مرتب شدہ
- لائبریری میں موجود کتب کو گھر بیٹھے سرچ کرنے کی آن لائن سہولت
- پاکستان میں 900 دینی رسائل وجرائد کے شماروں کا سب سے بڑا مرکز
- فاضل شخصیات اور ماہر لائبریرین کے ذریعے موضوع تک رہنمائی
- قدیم وجدید تحقیقات کے حامل جدید ایڈیشن
- عرب ممالک سے شائع ہونے والی نئی کتب کا مرکز
- فوٹو کاپی کروانے کی سہولت اور مسجد کا انتظام
- پرسکون محل وقوع اور تعلیمی اداروں کے سنگم میں

سہولیات

- جملہ اُردو عربی تفاسیر اور علوم قرآن کی تمام کتب
- حدیث نبوی، شروح حدیث اور علوم حدیث کے بیشتر مراجع
- فقہی مذاہب خمسہ کی اُمہات الکتب اور جدید فقہی موضوعات کا مستند ذخیرہ
- اسلامی سیاسیات واقتصادیات اور عمرانیات وغیرہ سے متعلقہ بیش بہا خزانہ
- اسلامی قانون سے متعلقہ جملہ اہم پہلوؤں پر اَسلاف کا نادر علمی ورثہ
- Ph.D وغیرہ محققین کے لیے علمی رہنمائی اور مشاورت

اوقات صبح 09:00 بجے تا شام 05:00 بجے (چھٹی بروز جمعہ)

ایئر کنڈیشنڈ ہال

بمقام ادارہ 'محدث' 99/ جے ماڈل ٹاؤن، لاہور 042-35866396 لائبریرین: محمد اصغر 0305-4600861

ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

ماہنامہ محدث
لاہور پاکستان

مدیر اعلیٰ
ڈاکٹر حافظ عبدالرحمن مدنی ﷾

مدیر
ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

جلد 50 — اگست 2019ء / ذوالحجہ 1440ھ — عدد 03

مجلس مشاورت
▪ حافظ صلاح الدین یوسف ▪ ڈاکٹر محمد حماد لکھوی ▪ ڈاکٹر محمد اسحاق زاہد
▪ ڈاکٹر حافظ انس مدنی ▪ ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی ▪ حافظ خضر حیات

ترسیل
محمد اصغر 0305 4600861

زرسالانہ =/300 روپے
فی شمارہ =/60 روپے

بیرون ملک
زرسالانہ =/20 ڈالر
فی شمارہ =/4 ڈالر

Monthly Muhaddis
A/c No: 984-8
UBL-Model Town
Bank Squre Market, Lahore.

دفتر کا پتہ
99 جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700
042-35866396, 35866476
Email:
Mohaddislhr@gmail.com
Publisher:
Hafiz Abdur Rahman Madni
Printer:
Shirkat Printing Press, Lahore.

فہرست مضامین

فکر ونظر — ڈاکٹر حافظ حسن مدنی
مغرب کے انسانی حقوق کے کرشمے! — 4

احکام و شرائع — حافظ صلاح الدین یوسف ؒ
طلاق کے ضروری مسائل واقسام — 25

تحقیق و تجزیہ — ڈاکٹر حافظ محمد زبیر
آلِ سعود اور عثمانی سلاطین کا تقابلی مطالعہ — 36

حدیث و محدثین — حافظ خضر حیات
امام مالک اور موطا: ایک تعارف — 54

رپورتاژ — عبدالرحمن عزیز
آدابِ اختلاف اور دعوتِ دین ② — 73

Islamic Research Council

محدث کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے، ادارہ کا مضمون نگار حضرات سے کلی اتفاق ضروری نہیں!

مغرب کے انسانی حقوق کے کرشمے!

بھارتی سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلوں کے تناظر میں

اللہ جل جلالہ کائنات، زمین وآسمان اور ان پر موجود تمام مخلوقات، جن وانس کا خالق ومالک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات اور انسان کو بلاوجہ پیدا نہیں فرمایا۔ یہ کوئی کھیل نہیں تھا کہ وہ یونہی آسمان وزمین کو تخلیق فرما دیتا، بلکہ اس ذاتِ متعال نے اس کائنات ومافیہا میں حق وباطل کی ایک کشمکش جاری فرمائی، اور جن وانس کو مکلف بنا کر، ان کی طرف انبیاورسل بھیجے، ان کے لئے نظامِ حکم وعدل قائم کیا۔ ہر انسان کے سامنے آخرت کا نصبُ العین مقرر کیا، کہ جو اللہ کی معرفت حاصل کر کے، اس کے بھیجے انبیاے کرام کے احکام پر چلے گا، اس کے لئے دنیا میں اطمینان وسعادت اور آخرت میں دائمی جنتیں اور باغات ہیں۔ جبکہ دنیا کو کھیل تماشے، لہوولعب، عیش وعشرت، نفس وشہوت پرستی، اور من مانیوں میں گزارنے والوں کے لئے، چند روزہ عیش ومستی کا تو امکان ہے، لیکن دنیا میں حقیقی، متوازن اور دائمی کامیابی اور آخرت میں نجات کے وہ کسی طور مستحق نہیں ہیں۔ کائنات، انسان، زندگی، اور اللہ کے بارے میں یہ سارا تصور 'توحید اور اسلام' (عبدیت اور اطاعت) کہلاتا ہے۔ یعنی "اللہ کی معرفت حاصل کر کے، اس کے فرستادہ پیغمبروں کے بتائے طریقوں کو اختیار کرنا تاکہ دنیا وآخرت میں کامیابی وکامرانی اُن کے قدم چومے۔" رسولوں کے ذریعے ملنے والا دین اللہ کے حقوق اور اس کے بندوں کے 'حقوق العباد' پر مشتمل ہے، اور جو انسان ان دونوں کے حقوق کی پاسداری کرتا ہے، وہی فلاح یافتہ ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں، جو عہدِ الست، فطری تقاضوں، عقل ودانش میں اللہ تعالیٰ کی معرفت کی پنہاں نشانیوں کو نظر انداز کر کے، سرکش ومتکبر شیطان کے مکر وفریب کا شکار ہوئے، اور اُنہوں نے اپنے تئیں اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں: زندگی، صحت، جوانی، عقل، طاقت اور فرصت کو عیش وعشرت اور سرور ومستی کے حصول کا ذریعہ سمجھا۔ اپنے مقصدِ تخلیق سے غافل ہو کر، ان کا مقصود ومنتہا زیادہ سے زیادہ اپنی خواہشات وشہوات کا فروغ ٹھہرا۔ اللہ، رسول، آخرت کی جب جب کوئی بات ان کے کان میں پڑی تو اس کو اُنہوں نے دقیانوسیت، تنگ نظری، غلامی، شدت پسندی، انتہا پسندی اور کٹھ ملائیت جیسے 'القابات' سے نوازا۔

ان کی مثال ایسے ہی ہے، جیسے کسی کو چند دنوں کے لئے بے شمار کھلونے (نعمتیں) مل گئے تو وہ ان سے لطف اندوز ہونے اور اُنہیں مزید جمع کرنے میں مشغول ہو گیا، ان کھلونوں کے نت نئے راز دریافت کرنے لگ گیا تاکہ زیادہ سے زیادہ تلذذ پا سکے اور اسے اس بات کی کوئی پروانہ رہی کہ یہ کھلونے کہاں سے آئے، کس نے بنائے اور کس نے دیے، کب تک اس کے پاس رہیں گے، اُنہیں دینے والا اس سے کیا توقع کرتا ہے، اس کا کیا فرض ہے؟ جب اس سے ایسے سنجیدہ سوال کیے جاتے ہیں تو وہ اسے پریشان فکری، سنجیدگی اور ذہنی غلامی قرار دے کر، صرف کھیل میں مگن رہنے کو ہی اپنی کامیابی، ترقی، اور خوشی کی معراج سمجھتا ہے۔ چنانچہ امریکہ کا تیسرا صدر، مشہور مفکر اور ماہر قانون تھامس جیفرسن (Jefferson)(م ۱۸۲۶ء) کہتا ہے:

"We hold these truths to be self-evident, that all men are created equal; that they are endowed by their Creator with inherent and inalienable rights; that among these, are life, liberty, and the pursuit of happiness"[1]

"ہم ان حقائق اور اُصولوں کو بدیہی (یعنی ہر دلیل سے ماورا) سمجھتے ہیں کہ تمام افراد پیدائشی طور پر مساوی ہیں، نیز یہ کہ ان کے خالق نے اُنہیں چند ناقابل ردّ حقوق ودیعت کر دیے ہیں جو یہ ہیں: زندگی، آزادی اور (اپنی خواہشات کے مطابق) حصولِ لذت کی جستجو۔"

آخری چند صدیوں میں جب سے انسان نے مصدقہ الٰہی تعلیمات (توحید) سے ناطہ توڑا، اور اللہ خالق کائنات کو نظر انداز کر کے اس کی عطا کردہ نعمتوں کو جمع کرنے میں محو ہو گیا، تو اپنی آزاد خواہشات و شہوات اور لہو ولعب کو جو دراصل شیطان کے مکر وفریب اور انسان کو ناکام ونامراد کرنے کے جال ہیں، انسان نے 'انسانیت اور اپنے حقوق' کا نیا نام دیا ہے۔ گویا 'الوہیت' (توحید) کے بالمقابل 'انسانیت' ایک متوازی نظریہ بن کر اُبھرا ہے۔ یہ انسانیت نوازی سے بڑھ کر 'انسان پرستی' کا روپ دھار گیا۔ اس دین انسانیت نے خالق کائنات کو چھوڑ کر، اپنی ذات میں خدا تلاش کرنے کی کوشش کی، اور اپنا خدا خود بن بیٹھا جس کو اس نے آزادی کے مقدس لفظ سے تعبیر کیا، لیکن اس آزادی کے پیچھے دراصل 'خالق سے آزادی' کا مکروہ تقاضا پنہاں تھا۔ اور قرآن کریم ایسی مادر پدر آزادی کو سرکشی (بَغیًا بَینَھُم) سے تعبیر کرتا ہے۔

---

1 Declaration of Independence, Papers 1:315, emphasis added

مغرب کی 'تحریکِ احیاے علوم' Renaissance کا مقصد، الہامی تعلیمات سے بغاوت کرتے ہوئے، اپنی چند روزہ محدود و مخلوق عقل سے اپنے لئے زندگی سے لطف اندوز ہونے کے ذرائع تلاش کرنا تھا۔ گویا یہ الحادی نقطہ نظر سے علوم و نظریات اور تہذیب و معاشرت کی تشکیل جدید ہے۔ اس کے پیش نظر ہی انسانی استدلال کے تانے بانے جوڑے گئے، اور اس کو علم (علانیہ یعنی سیکولرزم) قرار دیا گیا، اور خالق کو نظر انداز کرنے، اس کی تخلیق سے بغاوت کرنے، اس کے احکام کو پس پشت ڈالنے، اور یوم آخرت کو ایک مؤثر حقیقت کے طور پر تسلیم نہ کرنے کو 'سائنسی استدلال' کا نام دیا گیا۔ یہ پورا طرز فکر اہل مغرب میں 'انسان پرستی' (Humanism ہیومنزم) کی طرف پیش قدمی کرتا گیا، کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کو نظر انداز کر کے انسان کو اپنے تمام مسائل اپنے تئیں حل کرنے کا حق ہونا چاہئے اور انسان سے خارج علم و ہدایت کا کوئی ذریعہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس مقصد کے لئے ماضی قریب سے انسانی حقوق، آزادی، روشن خیالی، ترقی پسندی، رواداری کے الفاظ بھی بولے جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کا مشہور فرانسیسی فلسفی مائیکل فوکالٹ (م ۱۹۸۶ء) درست کہتا ہے کہ

"ہیومن Human تو پیدا ہی سترہویں اور اٹھارویں صدی میں ہوا۔"[1]

اس سے قبل اس کا وجود نہ تھا کیونکہ تمام مذاہب میں انسان کا تصور ہمیشہ 'عبد' ہی رہا ہے گو کہ اس عبدیت کی معتبر شکل کی تفصیلات میں مذاہب کے درمیان اختلاف رہا ہے۔

'ہیومن' محض ایک لغوی لفظ نہیں کہ جس کا ترجمہ 'انسان' کر کے اسے جن معنی میں چاہے استعمال کر لیا جائے بلکہ یہ ایک مخصوص تہذیبی اقدار کی عکاس اور مغرب کی علمی تاریخ سے برآمد ہونے والی ایک اصطلاح ہے۔ Humanity درحقیقت تحریکِ تنویر (Enlightenment روشن خیالی) کا کلیدی تصور ہے اور اس کا ترجمہ 'انسانیت' کرنا غلط ہے۔ 'انسانیت' کا درست انگریزی ترجمہ Mankind ہے اور یہی لفظ انسانی اجتماعیت کے لیے انگریزی زبان میں ۱۸ویں صدی سے قبل رائج تھا۔ Humanity کا تصور 'حقیقی انسانیت' کے تصور کی تردید ہے، ان معنوں میں کہ Human being عبدیت اور تخلیقیت کا اُصولاً اور عملاً انکار ہے۔ جرمن مفکر عمانویل کانٹ Kant (م ۱۸۰۴ء) کے مطابق

"Human being کا بنیادی وصف اور اس کی اصل "Autonomy" یعنی 'خود ارادیت' اور 'خود مختاریت' ہے۔"

---

۱ دیکھیں مائیکل فوکالٹ کا مضمون What is Enlightenment?

''چنانچہ 'ہیومن بینگ' وہ تصورِ انفرادیت ہے جس کے مطابق فرد ایک self-determined and self governed being (قائم بالذات اور خود مختار ہستی) ہے۔ اس انفرادیت کا بنیادی ایمان و احساس 'عبدیت' نہیں بلکہ 'آزادی' یعنی بغاوت ہے۔ انسان اپنے ربّ کی ہدایات اور رہنمائی کا مطیع ہوتا ہے جبکہ human being خود اپنا رب ہوتا ہے اور وہ جو چاہتا ہے، اسے کر گزرنے کا مکلف سمجھتا ہے۔ لہٰذا ہیومن کا درست ترجمہ 'انسان' نہیں بلکہ 'شیطان' ہے (Human is actually Demon)۔ کیونکہ ہیومن بالکل اسی طرح اپنے ربّ کا باغی ہے جس طرح ابلیس شیطان۔ معلوم ہوا کہ ہیومن رائٹس کا معنی 'انسانی حقوق' نہیں بلکہ 'شیطانی حقوق' ہے۔''[1]

اہل مغرب جس طرح اپنی سیاست میں تفرق و تشتت، دھوکہ و فریب اور جنگ میں سفاکانہ قتل و غارت کے لئے مشہور ہیں، اسی طرح اپنے اسالیبِ علم میں بھی یہی ملمع سازی ان کی روایت رہی ہے۔ اگر وہ سیدھے تیئں اپنے نظریات کو مذہب مخالفت قرار دیتے، اور اسے اپنی انسانی خواہش پسندی بیان کرتے تو اعتراض نہ کیا جاتا، لیکن اُنہوں نے اپنے مذہب سے بالاتر نظریات کو پہلے تو مادر پدر آزاد عقلی مباحثات پر قائم کیا، پھر ان کو ثابت کرنے کے لئے اسلامی تعلیمات سے دلائل جمع کئے، پھر ایسے الفاظ اختیار کئے جو بظاہر دیدہ زیب ہوں، اور توحید و عبدیت کے علمبرداروں اور شیطان و بغاوت کے پیروکاروں میں مشترک سمجھے جاتے ہوں۔ پھر ان کے تحت اپنے کفر کو ملفوف کر کے مسلمانوں میں پھیلایا۔ ان کی اس چالبازی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کفریہ نظریات آج مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر، اسلامی حوالوں کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ ایسی علمی اصطلاحات کے طور پر آزادی، مساوات، ترقی، جمہوریت، انسانی حقوق، برداشت، رواداری اور فرقہ واریت کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جن میں ہر لفظ مشترک المعنیٰ ہے، ان کا ایک درست مفہوم ہے جو انبیا کی تعلیمات میں پایا جاتا ہے اور ایک مفہوم وہ ہے جس کے لئے کفر اُنہیں استعمال کرتا ہے۔ مسلمانوں میں بڑے نامور اہل دانش بھی ان الفاظ کے ظاہری حسن سے مغالطہ کھا کر ان کی تائید کرتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن جب ان کے استعمال واثرات سے مغربی افکار میں ان کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ اصطلاحات کفر کی گمراہی میں لتھڑی ہوئی اور شیطان کی چالوں کا بڑا استعارہ ہیں۔ اسلامی عقائد کی مشہور کتاب میں امام ابن عبد العز حنفی لکھتے ہیں:

وَالسَّلَفُ لَمْ يَكْرَهُوا التَّكَلُّمَ بِالْجَوْهَرِ وَالْجِسْمِ وَالْعَرَضِ وَنَحْوِ ذَلِكَ لِمُجَرَّدِ كَوْنِهِ

---

[1] 'جدید اعتزال کے فکری ابہامات کا جائزہ' از ڈاکٹر زاہد صدیق مغل: شائع شدہ 'محدث' نومبر ۲۰۰۹ء

اصْطِلَاحًا جديدًا على معان صحيحة، كالاصطلاح على ألفاظ العلوم الصحيحة، وَلَا كَرِهُوا أَيْضًا الدَّلَالَةَ عَلَى الْحَقِّ وَالْمُحَاجَّةَ لِأَهْلِ الْبَاطِلِ، بَلْ كَرِهُوهُ لِاشْتِمَالِهِ عَلَى أُمُورٍ كاذبة مخالفة للحق، ومن ذلك مخالفتها الكتاب وَالسُّنَّةَ، وَلِهَذَا لَا تَجِدُ عِنْدَ أَهْلِهَا مِنَ الْيَقِينِ وَالْمَعْرِفَةِ مَا عِنْدَ عَوَامِّ الْمُؤْمِنِينَ، فَضْلًا عَنْ عُلَمَائِهِمْ.[1]

"ائمہ اسلاف (علم الکلام کی) اصطلاحات: مرکب، جوہر، جسم، عرض وغیرہ کو محض اس بنا پر استعمال کرنا ناپسند نہیں کرتے کہ یہ صحیح معانی پر دلالت کرنے کے لئے اُسی طرح کی نئی اصطلاحات ہیں جیسا کہ صحیح علوم کی عام اصطلاحات ہوتی ہیں، اور نہ ہی اس بنا پر کہ یہ اصطلاحات حق کی نشاندہی اور اہل باطل پر حجت قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں بلکہ ائمہ اسلاف کے ترک کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان اصطلاحات میں حق کے برخلاف جھوٹے مفاہیم پائے جاتے ہیں اور ان کے ذریعے کتاب وسنت کی مخالفت کی جاتی ہے۔ یہی وجہ کہ ایسی اصطلاحات بولنے والے لوگ اس علم ویقین کے حامل نہیں جو علمائے اسلام سے بڑھ کر، عام مسلمانوں کو بھی حاصل ہے۔

ان اصطلاحات میں کار فرما حق وباطل کے ملغوبے کی بنا پر لوگوں میں اختلافات اور جھگڑے پنپنا شروع ہوگئے، اور قیل وقال پھیل گیا، اور لوگوں میں ایسے اقوال جنم لینا شروع ہوگئے جو شرعِ صحیح اور عقل صریح کے مخالف تھے اور اس سے امکانات تنگ تر ہوتے گئے۔"

پروفیسر مفتی محمد احمد لکھتے ہیں:

"جب مغرب کسی نظریہ کو پیش کرتا ہے تو اس نظریہ کے اظہار کے لیے ایسا لفظ اختیار کیا جاتا ہے جو لوگوں میں اچھے معنوں میں استعمال ہو اور لوگوں میں مانوس ہو جائے یعنی لفظ کی ذاتی کشش اس نظریہ کو لاشعوری طور پر لوگوں کے دل میں نقش کرتی چلی جائے اور باطل کو حق کے ساتھ ملا کر یوں پیش کرتا ہے کہ عام نظر رکھنے والا آدمی حق وباطل میں فرق کو واضح نہ کر سکے اور فرق نہ کرنے کی وجہ سے یا تو کلی طور پر انکار کر دے گا جس میں حق کا بھی انکار کر بیٹھے گا اور اس کا موقف کمزور ہو جائے گا۔ یا پھر تصدیق کرے گا اور تصدیق وحمایت میں حق کے ساتھ باطل کو بھی صحیح تسلیم کرے گا۔ یعنی مغربی فکر کی مکاری وچالاکی سے ناواقف فرد دجل کا شکار ہو جائے گا۔ ان کی تقریباً ہر اصطلاح میں یہ ہوتا ہے، وضاحت کیے بغیر کلی طور پر رد کر دیں تو اعتراضات کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور اگر

---

1 شرح عقیدہ طحاویہ از امام ابن ابی العز الحنفی: ص ۱۰، وزارت مذہبی اُمور، سعودی عرب

حمایت کریں گے تو باطل کی حمایت کرنے والوں میں شامل ہو جائیں گے۔"[1]

'انسانی حقوق' جمہوریت کا مقصود و منتہا ہے۔ یعنی جمہوری معاشرے اور جدید الحادی ریاست جس منزل کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، اسے 'انسانی حقوق' کا نام دیا جاتا ہے۔ در حقیقت 'اللہ کی ہدایات کو پس پشت ڈال کر انسانی خواہشات کی تکمیل' کے لئے بھی 'انسانی حقوق' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ آگے مذکور عدالتی فیصلوں سے ثابت ہو گا۔ تاریخی طور پر انسانی حقوق مغربی اقوام کی تمام تر تعقل پسندی کا نچوڑ ہیں۔ یونانی فکر و فلسفہ سے شروع ہو کر، اہل روم ر مغرب کے فکری امام برطانیہ کے 'عظیم منشور' میگنا کارٹا ۱۲۱۵ء، آزادی کے علم بردار امریکہ کے 'اعلانِ آزادی ۱۷۷۶ء' اور 'نوشتہ حقوق ۱۷۷۹ء' اور فرانس کے 'اعلان حقوقِ انسانی و باشندگان ۱۷۸۹ء' جیسی اہم دستاویزات جو چار صدیوں پر محیط ہیں، نے اقوام متحدہ کے 'عالمی چارٹر برائے انسانی حقوق ۱۹۴۸ء' کو جنم دیا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں برطانوی ادیب ایچ جی ویلز H.G. Wells نے اپنی کتاب 'دنیا کا نیا نظام' New World Order میں اس عالمی منشور انسانی کی تجویز اور ماڈل پیش کیا۔ جرمن مصنف ڈگلس سٹیون سن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ

> The 1789 Declaration, together with the 1215 Magna Carta, the 1689 English Bill of Rights (1689), the 1776 United States Declaration of Independence, and the 1789 United States Bill of Rights, inspired in large part the 1948 United Nations Universal Declaration of Human Rights.[2]

"فرانس کا 'اعلان انسانی حقوق' دراصل برطانیہ کے 'عظیم منشور'، برطانیہ کے ہی 'نوشتہ حقوق'، امریکہ کے 'اعلان آزادی'، اور امریکہ کے ہی 'نوشتہ حقوق'، یہ سب مل کر اقوام متحدہ کے 'عالمی منشور انسانیت' کا بڑا اور نمایاں حصہ ہیں۔"

مغربی اقوام کے 'نظریات و مفادات' کی محافظ اقوام متحدہ نے 'اتحاد و اتفاق' کے مبارک نام پر اس دستاویز کو دنیا بھر میں ایک تقدس عطا کیا ہے۔ اکیسویں صدی کی نام نہاد مہذب دنیا کا یہ وہ انسانیت پرور منشور ہے جس کو 'اسلام کے تصورِ توحید' کی طرح پوجا جاتا ہے۔ انسانی حقوق وہ 'مبارک وسیلہ اور منزل' ہے جس کو ہر ملک بہ

---

1 'تعارف تہذیب مغرب اور فلسفہ جدید' از پروفیسر محمد احمد، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، جنوری ۲۰۱۴ء، ص ۱۰۳۔۱۰۴

2 Douglas K. Stevenson (1987), American Life and Institutions, Stuttgart, p. 34

شمول پاکستان کے دستور میں اساس کی حیثیت حاصل ہے، اور پورا دستور اس کے تحفظ کے گرد گھومتا ہے۔ عدالتیں اس کے تحت ہی عدل وانصاف مہیا کرنے کی پابند ہوتی ہیں۔ ابلاغی ادارے انسانی حقوق کی پاسداری نہ کرنے پر بین Ban کر دیے جاتے ہیں۔ امریکہ کے انسانی حقوق کے ادارے اور اقوام متحدہ کی ایمنسٹی انٹرنیشنل انسانی حقوق کی مخالفت کے نام پر قوموں کو لگام ڈالتے اور ان کے خلاف 'جائز فوج کشی' کے سفاکانہ اقدام کرتے ہیں۔ الغرض مغرب کی پانچ صد سالہ الحادی فکر کا نچوڑ، اس کی سیاسی و معاشرتی زندگی کی معراج اور اس کا سب سے بڑا جنگی ہتھیار یہی انسانی حقوق ہیں۔

اسلام اللہ کا دین ہے، نبی مکرم ﷺ رحمۃ للعالمین اور محسن انسانیت ہیں۔ انسان اللہ کی اشرف المخلوق ہے، اور اللہ اپنی مخلوق کے لئے ماں سے زیادہ مہربان ہے اور اس کا تعارف ہی رحمٰن ورحیم ہے، اس کی رحمت کائنات کی ہر شے کو حاوی ہے۔ اسلام کے مقاصد میں جان، مال، عزت، عقل اور نسل کا تحفظ اصل الاصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلام تکریم انسانیت کا داعی اور غیر مسلم کے لئے بطورِ انسان احترام کا تقاضا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق پر رسولوں کے ذریعے ملنے والی پوری شریعت کا مدار رکھا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس شریعت میں شرک کے گناہ کو چھوڑ کر باقی حقوق العباد زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ حقوق کا جتنا خوبصورت توازن اللہ کا دین پیش کرتا ہے، انسانوں کی عقل اجتماعی اس کے عشر عشیر تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ کیونکہ اللہ کو اپنی تمام مخلوقات سے بے انتہا محبت ہے اور وہ ان کی مصلحت کو لئے ہی شریعت کو نازل کرتا ہے۔ تاہم اسلام میں مقاصدِ شریعت اور حقوق العباد کا صرف لفظ نہیں دیا گیا بلکہ اس کا کامل نظام بھی پیش کیا گیا ہے، جس میں مقاصد و حقوق کی حد بندی بھی کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے حقوق کو رسول اللہ ﷺ نے ہی محدود و متعین بھی کر دیا ہے۔

اسلام میں حقوق العباد کی اہمیت کی بنا پر نامور مسلم علما نے انسانی حقوق اور شریعت اسلامیہ کے مابین موافقت و مطابقت پر مبنی بیش قیمت مباحث لکھے ہیں۔ ان کتب میں رابطہ عالم اسلامی کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر عبد اللہ عبد المحسن الترکی کی حقوق الإنسان في الإسلام، ڈاکٹر رفعت مُرسی کا ۶ جلدوں میں موسوعة حقوق الإنسان (دار النوادر، لبنان) اور ڈاکٹر سلیمان الحقیل کی حقوق الإنسان في الإسلام والرد علی الشبهات (اردو ترجمہ مجلس التحقیق الاسلامی)، شیخ محمد بن صالح العثیمین کی 'بنیادی حقوق' (دار السلام، لاہور)، مولانا عبد الرحمٰن کیلانی کا کتابچہ 'انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات' (محدث اکتوبر ۲۰۰۱ء)، مولانا زاہد الراشدی کی 'اسلام اور انسانی حقوق' (الشریعہ اکادمی) کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان کی کتب کے مطالعے سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے

انسانی حقوق اور حقوق العباد کفر واسلام کے مابین نقطہ اشتراک بن سکتے ہیں، کیونکہ یہ اہل علم دونوں مقابل نظریات کے مابین مطابقت اور مفاہمت کے قائل ہیں۔ تاہم یہ اہل علم مغرب کی پیش کردہ انسانی حقوق کی اصطلاح سے قطع نظر خوبصورت الفاظ کے سحر میں گرفتار رہے ہیں، کاش کہ وہ ان کے ثمر اور استعمال پر بھی غور کر لیتے تو کبھی ایسے مشتبہ نعروں کو اسلام سے ثابت کرنے میں زیادہ توجہ نہ صرف کرتے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مغرب کے انسانی حقوق کے مقابل اسلامی انسانی حقوق کا نعرہ بلند کرنا چاہیے، اور اس کو اسلام سے مشروط کر دیں تو تناؤ اور تصادم کی فضا میں کمی کی جاسکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے او آئی سی کے تحت ۱۹۹۲ء میں 'اسلامی انسانی حقوق' کا ۲۵ دفعاتی چارٹر[1] بھی منظور کیا جاچکا ہے۔ سعودی اور پاکستانی دساتیر[2] میں بھی یہی تدبیر استعمال کی گئی ہے۔ لیکن ذیل میں پیش کئے جانے والی مثالوں کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ جس طرح مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت[3] کے نعرے سے مغالطوں کے سوا کچھ نہیں

---

۱ ۵/ اگست ۱۹۹۰ء میں منعقدہ قاہرہ کانفرنس میں 'اسلامی انسانی حقوق' کے ۲۵ نکاتی چارٹر Cairo Declaration on Human Rights in Islam (CDHRI) میں پیش کرکے، رکن ممالک سے دستخط لئے گئے جو اقوام متحدہ کے چارٹر کا متبادل ہے۔ اس چارٹر کے آخری آرٹیکلز ۲۴ اور ۲۵ کا انگریزی متن یہ ہے:

24. All the rights and freedoms stipulated in this Declaration are subject to the Islamic Shari'ah.

25. The Islamic Shari'ah is the only source of reference for the explanation or clarification of any of the articles of this Declaration.

"۲۴۔ اس اعلامیہ / چارٹر میں مندرج تمام حقوق اور آزادیاں شریعت اسلامیہ سے مشروط ہیں۔"

"۲۵۔ اس اعلامیہ میں مندرج تمام آرٹیکلز کی تشریح اور وضاحت کا واحد مستند ماخذ شریعت اسلامیہ ہے۔"

۲ سعودی دستور ۱۹۹۲ء: المادة السادسة والعشرون: تحمي الدولة حقوق الإنسان وفق الشريعة الإسلامية.

"آرٹیکل ۲۶: مملکت شریعت اسلامیہ کے مطابق حقوقِ انسانی کی حفاظت کرے گی۔"

دستور پاکستان ۱۹۷۳ء: قرار دادِ مقاصد کے الفاظ: "پاکستان میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدلِ عمرانی کے اُصولوں پر جیسا کہ اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پوری طرح عمل کیا جائے گا۔" اور آرٹیکل ۱۹: "اسلام کی عظمت، پاکستان کی سالمیت... اور قانون کی عائد کردہ مناسب پابندیوں کے تابع ہر شہری کو تقریر، اظہار خیال کی آزادی اور پریس کی آزادی ہوگی۔" وغیرہ

۳ کسی تہذیبی اقدار کے حاملین اس بات پر سمجھوتہ نہیں کرتے کہ ان کے شعائر کی نمائندہ اصطلاحات کو کسی دوسری تہذیب کے لوگ اپنے خود ساختہ معنی میں استعمال کرکے مغالطہ دیں۔ مثلاً ہمارے ہاں قادیانی خود کو 'مسلمان' اور اپنے مذہب کو 'اسلام' کہتے ہیں مگر ہم اصطلاح "اسلام" کے اس فکری اغوا پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے اور نہ ہی "قادیانی اسلام" کی کسی اصطلاح کو برداشت کرنے پر تیار ہوتے ہیں بلکہ ہم قادیانیوں کو ہمیشہ "خارج از اسلام" اور "کافر و مرتد" ہی کہتے ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک اسلام صرف وہی ہے جو معتبر ذرائع کے ذریعے قرآن و سنت اور اجماعِ اُمت کی صورت میں ہمیں ملا ہوا، اس کے علاوہ اسلام کسی شے کا

ملا، اور جمہوریت کے گرد تقدس کا ہالہ گہرا ہوتا گیا، اب آہستہ آہستہ عملی مثالوں سے جمہوریت کے حسین پردے سے دیو استبداد کی نقاب کشائی ہو رہی ہے، اسی طرح انسانی حقوق کے نام پر مغرب کی ملمع سازی، مغالطہ آرائی کی کوششوں کا نقاب بھی کھل جانا چاہیے اور اسلام کے علم برداروں کو سرکشی کی اصطلاحات کا محتاج اور اسیر نہیں ہونا چاہیے۔

اقوام متحدہ کے تحت ہر قوم (مثلاً پاک وہند) کو اس وقت تک کامل آزادی اور قومی تعلقات وتجارت کی سہولت نہیں دی جاتی جب تک اقوام متحدہ کی ہدایات کے مطابق تیار کردہ ایسا دستور منظور نہ کرلیا جائے جس میں انسانی حقوق کی 'آئینی غلامی' اختیار کرلی گئی ہو۔ پھر پوری ریاست کا نظام سیاست وعدل، معیشت ومعاشرت اور تعلیم وابلاغ اسی دستور کے ذریعے 'انسانی حقوق کے تحفظ' پر کاربند ہو جاتے ہیں، اور دستور وعدالتیں اس کی حاکمیت کو دوٹوک استحکام عطا کرتی ہیں۔ راقم نے اپنے ایک مستقل مضمون میں 'مختلف ممالک کے دساتیر میں انسانی حقوق کے تحفظ کے قوانین اور عدالتی کردار' کا ایک معروضی تجزیہ لے کر ان دعووں کو ثابت کیا ہے۔

اقوام متحدہ 'مساوات کے نام پر' اپنی سلامتی کونسل کے ذریعے دنیا بھر میں صرف پانچ کفریہ طاقتوں کے مفادات کو تحفظ دیتی ہے۔ 'عالمی منشور انسانیت' کے ذریعے سیاسی حقوق کے عنوان سے مسلم معاشروں کو سیاسی جماعتوں کی پارٹی بازی اور مسلم ممالک کو وطنیت کے تراشیدہ بت کا اسیر کرتی اور اسی طرح معاشرے میں ٹکراؤ اور ملت کے جسدِ واحد کی بجائے اپنے اپنے علاقائی مفادات کو رواج دیتی ہے۔ مساوات کے نام پر خواتین کو مردوں کے مقابل لاکر، خاندانی فرائض سے متنفر کرتی اور اُنہیں نکاح وطلاق میں عین مردوں جیسے

نام نہیں۔ بالکل اسی طرح ہیومن رائٹس بھی ایک تہذیب کی نمائندہ اصطلاح ہے جسے اگر ہم اسلامیانا چاہیں تب بھی اہل مغرب اس کی کسی مسخ شدہ تشریح کو سند ماننے پر ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔ آپ اپنی خوشی کے لئے جو اصطلاح وضع کرنا چاہیں کیجئے مگر یہ اُمید رکھنا کہ مغرب آپ سے اسی اصطلاحی معنی پر مکالمہ کرے گا، خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہیں۔

مغربی اصطلاحات کو 'اسلامی' کا سابقہ لگا کر ترویج دینا در حقیقت اسلامی تعلیمات کو مغربی تناظر میں پہچاننے کا نتیجہ ہے اور یہ طرزِ فکر مرعوبیت کے سوا اور کچھ نہیں۔ غور تو کیجئے کہ تحریکِ تنویر کے آدرشوں پر عمل پیرا ہو کر مغربی اہل علم نے جب عیسائی علمیت و تہذیبی اداروں کو شکست دی تو کسی تجدد زدہ مفکر نے کسی نمائندہ عیسائی اصطلاح کو اپنی علمیت میں کوئی جگہ نہ دی۔ اسی طرح استعمار نے مسلمان علاقوں میں خلافت کے ادارے کو ختم کیا تو مسلمان عوام میں اپنی جگہ بنانے کیلئے 'جمہوری خلافت' یا 'مغربی خلافت' جیسی اصطلاحات استعمال نہیں کیں بلکہ ہر جگہ اپنی تہذیبی و علمی روایت سے برآمد شدہ اصطلاح 'جمہوریت' ہی متعارف کروائی۔ اور اس طرح اپنے 'مشترک کلمہ' کی طرف اُنہوں نے مسلمانوں کو گھسیٹا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے اہل علم میں اتنی علمی جرات بھی نہیں کہ وہ مغرب کی نمائندہ اصطلاحات کو ردّ کر کے ان کی جگہ اسلامی اصطلاحات وتصورات کے فروغ پر ہی اِصرار کریں؟

حقوق[1] دینے کی داعی ہے جن کی شریعت تائید نہیں کرتی۔ ارتداد کی اجازت اور کھلے عام سزا کی ممانعت کے ذریعے اسلام کے جرم وسزا کے احکام کو معطل کرنے پر دباؤ ڈالتی ہے۔ راقم نے ایک مستقل مضمون میں 'انسانی حقوق کے ایسے خلاف شرع آرٹیکلز' کا بھی جائزہ لیا ہے۔

ذیل میں مغرب کے انسانی حقوق کی چند مثالوں اور ثمرات سے حقیقت ملاحظہ کریں:

انسانی حقوق کے ثمرات

ہر نظریہ بظاہر اپنے فروغ کے لئے بڑے خوبصورت استدلال اور الفاظ چنتا ہے، اور انہی دیدہ زیب اصطلاحات سے ہر اہم مقام پر سندِ قبولیت حاصل کرتا ہے، لیکن جس طرح درخت کو پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح انسانی حقوق کے خوش نما نعرے کا ثمرہ ملاحظہ کریں کہ یہ مغربی نظریہ حقوق کس طرح مادر پدر آزادی کا محافظ ہے اور اعلیٰ عدالتوں کے ذریعے فروغ پاتا ہے:

① انسانی حقوق؛ ہم جنس پرستی اور لواطت کے محافظ: ۶/ستمبر ۲۰۱۸ء میں بھارتی سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں قرار دیا کہ

"کسی فرد کا جنسی رجحان اس کا انفرادی اور فطری معاملہ ہے اور 'جنسی رجحان کی بنیاد پر کسی سے تفریق برتنا اس شخص کے اظہارِ آزادی کے حق کی خلاف ورزی' ہے۔ عدالت نے مزید کہا کہ 'فرد کے انتخاب کا احترام آزادی کی روح ہے۔ ہم جنس پرست برادری کو ملک کے دیگر شہریوں کی طرح آئین کے تحت برابر کا حق حاصل ہے۔ دفعہ ۳۷۷ کی شقوں کے تحت مرد اور مرد یا عورت اور عورت کے درمیان سیکس کو جرم قرار دیا گیا تھا جو کہ فرد کی آزادی اظہار کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔'"[2]

۲۴ برس اور کئی اپیلوں کے بعد آنے والے اس فیصلے پر ہم جنس پرستوں اور حقوق انسانی کی تنظیموں نے زبردست خوشی کا اظہار کیا جبکہ ملک کے مذہبی رہنما ہم جنسیت کے خلاف ہیں۔ معاشرے میں بھی ایک بڑی تعداد ہم جنس پرستی کے رشتوں کو قبول نہیں کرتی اور اسے غیر فطری سمجھتی ہے۔

برصغیر میں ۱۵۷ سال پرانے برطانوی دورِ حکومت کے قانون ۱۸۶۰ء میں 'کسی مرد، خاتون یا جانور کے

---

1 مثلاً عورتوں کو نکاح میں والدین کو چھوڑ کر من پسند شادی کا حق، طلاق میں مردوں کی طرح برابری کا حق، اور تعدد ازدواج میں مساوات کے نام پر، مردوں کی طرح چار سے تعلقات کا حق وغیرہ

2 https://www.bbc.com/urdu/regional-45440473

ساتھ قدرتی اصولوں کے خلاف جنسی تعلق کا قیام 'کو 'غیر قدرتی جرائم' قرار دیتے ہوئے اس کی سزا دس سال قید مقرر کی گئی تھی۔ انسانی حقوق کے کارکنان کے مطابق

''ایسے کسی قانون کی موجودگی صنفی بنیادوں پر امتیازی سلوک کا ثبوت ہے۔''

انسانی بنیادی حقوق، جدید ریاست میں اس قدر بنیادی مقام اور اصل منزل کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ۷۰ برس سے بھارتی پارلیمنٹ کی تائید سے بہرہ مند مروجہ قوانین بھی اس کے خلاف ہوں تو اُن کو منسوخ کر دیا جائے۔ اگر اکثریتی عوامی رائے بھی اس کی تائید نہ کرے تو اکثریت کو جھوڑ کر روشن خیالی، ترقی پسندی کو ترجیح دینا ہوگی۔ چنانچہ بھارتی عدالتِ عظمیٰ نے اپنے فیصلے میں کہا کہ

''کوئی بھی معاشرہ اکثریت کی اخلاقیات سے نہیں چلتا۔ عدالت نے کہا کہ 'ایک آئینی معاشرہ تخلیق کرنے کا بنیادی مقصد اس معاشرے کو ایک روشن خیال معاشرے میں تبدیل کرنا ہے۔''

ہمیشہ سے خالق کائنات نے انسان سمیت دیگر حیوانات میں مذکر و مؤنث کا جوڑا بنایا ہے، اور یہی فطری رجحان ہمیشہ سے بھارت میں چلا آرہا تھا۔ لیکن مادر پدر آزادی کا خوگر مغربی انسان، دراصل وحی الٰہی کی رہنمائی کو فکری غلامی اور دقیانوسیت سے تعبیر کرتا ہے اور اپنی فرعونیت نواز آزادی کو روشن خیالی کا نام دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں فطرت، مذہب اور الہام کی ہر شکل دقیانوسیت ہے اور تعقل و تجربیت کی ہر صورت روشن خیالی ہے۔

ہم جنس پرستی، دراصل اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور نظامِ فطرت کا کھلا انکار ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ایک مرد و عورت کو جوڑا بنایا اور ان کے ذریعے نسل انسانی کا سلسلہ آگے چلایا۔ دنیا کے ۱۷۷ ممالک میں اس وقت ہم جنس پرستی کو قانونی جواز عطا ہو چکا ہے، اور ان میں ترکی، بوسنیا، مالدیپ اور بعض وسط ایشیائی سابقہ روسی ممالک بھی شامل ہیں۔ بھارتی سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کے بعد بھارت بھی ان ممالک کی فہرست میں تازہ اضافہ ہے۔

ہم جنس پرستی دراصل انسانیت پر ستی کا اظہار اور اُلوہیت و توحید کی نفی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی یورپی کے جن ممالک میں خدا بیزاری کی شرح دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے، وہ ہم جنس پرستی میں بھی سب سے آگے ہیں۔ ان کے بعد مشرقی یورپ کے (ایشیا کے قریب تر) ممالک میں ہم جنس پرستی کی شرح کمتر دکھائی دیتی ہے۔ امریکہ میں اس بدفعل کی مقبولیت اس سے بھی کمتر درجے میں ہے۔ تاہم مسلم ممالک جو دنیا کے مرکز میں ایک مسلسل زنجیر کی طرح ملے ہوئے ہیں، میں اس سنگین جرم کے متعلق حساسیت کا یہ عالم ہے کہ وہاں ان کے بارے میں اعداد و شمار جمع کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔

انسان اپنے حقوق کو اپنے تئیں متعین کرنے کی کوشش میں اس حد تک آگے بڑھ چکا ہے کہ مرد و عورت کے نفسیاتی و طبعی وجود میں پائے جانے والے جنسی مظاہر کو بھی نظر انداز کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اکیسویں صدی کے خواہشات کے ہاتھوں غلام کے سامنے صرف اور صرف اپنی مرضی، خواہش ہے، جسے وہ کبھی عقلیت، کبھی حقوق اور کبھی امتیاز کے خاتمے کے نام پر جواز دینے کی پیہم سعی میں مشغول ہے۔ اُلوہیت سے باغی، انسانیت پرستی کے ان بڑھتے رجحانات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مستقبل قریب میں یہ انسان ماں سے بیٹے اور بیٹی سے باپ اور دیگر محارم کی باہمی شادیوں کو بھی باہمی جواز عطا کرے گا۔ کیونکہ طبعی طور پر ان رشتوں کی باہمی مناکحت میں سوائے الہامی تعلیمات کے کوئی رکاوٹ موجود نہیں، جن سے انسانی سماج تا حال باہر نکل نہیں رہے۔ جوں جوں عقل اور خواہش پرست انسان سماجی روایات اور مذہبی تعلیمات سے آزاد ہوتا گیا، مغربی محاورہ میں جوں جوں روشن خیال اور ترقی پسند ہوتا گیا، وہ اپنی ماں سے بھی نکاح رچانا اپنا حق قرار دے گا۔

بظاہر دنیا بھر کی اقوام کے اتحاد کی نمائندہ لیکن درحقیقت مغربی اقوام کی سرکشی کو دنیا میں تحفظ اور فروغ دینے والی اقوام متحدہ نے بھی ۲۰۰۸ء میں اپنے رکن ممالک کو ہم جنس پرستی کے فروغ کی تلقین کر رکھی ہے، اور اقوام متحدہ کی ایمنسی انٹرنیشنل اپنے جائزے مرتب کرتے ہوئے، اپنے مطالبوں کو پیش نظر رکھتی ہے۔ چنانچہ انڈونیشیا کے آچے نامی صوبہ، جس میں شرعی قوانین نافذ ہیں، میں جب ہم جنس پرستوں کو سزا دی گئی تو

"انڈونیشیا میں انسانی حقوق کے سرگرم کارکنان نے اس ملک کے صوبہ آچے کی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ان چار افراد کو جلد رہا کرے جن پر ہم جنس پرستی کا الزام ہے۔ مقامی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ ہم جنس پرستی کے الزام میں چار افراد کو جرائم پر نظر رکھنے والے افراد اور پولیس نے حراست میں لیا تھا۔ ان افراد پر جرم ثابت ہونے کی صورت میں انہیں ایک سو کوڑوں کی سزا سنائی جاسکتی ہے۔

انسانی حقوق کی تنظیموں نے اس ہم جنس پرست جوڑے کو سنائی جانے والی سزا کی مذمت کی ہے اور ان کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کیس کے حوالے سے 'ہیومن رائٹس واچ' نے کہا تھا کہ اس جوڑے کو کوڑے مارے جانا تشدد تصور کیا جائے گا۔ انڈونیشیا میں ہیومن رائٹس واچ کے ایک محقق نے اے پی کو بتایا: "یہ سزا بہت سخت ہے۔"[1]

بعض لوگ ہم جنس پرستی کو جنسی خلل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، اور اسے مرد و عورت سے بالارہ کر تیسری

1 https://www.dw.com/ur/a-38873693-0

صنف کی طرف بڑھنے والوں کے مسائل کا حل بتاتے ہیں، اپنے استدلال میں وزن پیدا کرنے کے لئے ایک فیصد سے بھی کہیں کم جنسی اختلال کے مریضوں کی تعداد کو دس گنا تک بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اتنی کم تعداد کے مسئلہ کے سنجیدہ حل تلاش کرنے کی بجائے اسے انسانی حقوق کے نام پر فروغ دینا در حقیقت نری خواہش اور شیطان پرستی ہے۔ سیدنا لوط علیہ السلام کی قوم سدوم ماضی میں اس علت کا شکار رہی اور ان کا مسئلہ بھی صنفی خلل کی بجائے، دماغی خلل کا ہی تھا، تبھی اللہ تعالیٰ نے ان کی بستی کو ہی ان پر اُلٹا دیا۔ اور قرآن کریم نے جا بجا ان کا تذکرہ شرمناک اور عبرت آموز انداز میں کیا ہے۔ افسوس کہ آج کا ترقی یافتہ انسان قدامت کی شرمناک غلاظتوں اور جاہلیتِ قدیمہ کو انسانی حقوق کے نام پر حاصل کرنے میں کوشاں ہے۔

☆ بھارتی سپریم کورٹ نے جمہوریت کے تقدس کی ایک اور حقیقت بھی بے نقاب کی ہے، کہ عام طور پر اس کو عوام کی حکومت (ڈیموکریسی) اور کبھی اکثریت کی منشا (جمہوریت) قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن دراصل جمہوریت کے اس ظاہری نقاب کے پیچھے 'روشن خیالی اور ترقی پسندی' کی معراج چھپی بیٹھی ہے۔ جمہوری ریاستیں جس دستور کو رواج دیتی ہیں، اس کا عدالتی نظام اکثریت کے بنائے قوانین کو ٹھوکر مار کر، انسانی حقوق کے نام پر روشن خیالی کی منزل تک پہنچنے کو بے چین ہے۔ اور روشن خیالی کا مطلب تو آغاز میں بیان ہو چکا ہے کہ مذہب (اور اس کی کامل ترین شکل اسلام) کو براہِ راست نشانہ بنانے کی بجائے، دقیانوسیت، تنگ نظری، روایت پسندی کے الفاظ بول کر لوگوں میں اس سے نفرت پیدا کرنا۔ گویا جب تک اکثریت کے نام پر روشن خیالی اور نفس پرستی کو رواج مل جائے تو اسے عوام کی اکثریت کے نام لگا دو اور جب عوام کی اکثریت ساتھ نہ دے تو پھر دقیانوسیت کے نام پر اس سے پیچھا چھڑا لو۔ یہ ہے نئے دور کی جاہلیت قدیمہ اور اس کے پر فریب ہتھکنڈے!

② **انسانی حقوق؛ ازدواجی بدکاری کا لائسنس:** انسانی حقوق کی مزید کارفرمائی اور اس کے مذہب مخالف ثمرات دیکھنے کے لئے پھر بھارتی سپریم کورٹ کی طرف ہی رجوع کریں۔ سپریم کورٹ کے پانچ رُکنی بنچ نے اپنے متفقہ فیصلے میں لکھا کہ

"مجموعہ تعزیراتِ ہند کی ۱۵۸ سال قدیم دفعہ ۴۹۷، جس کے تحت کسی شادی شدہ عورت کے ساتھ اس کے شوہر کی مرضی کے بغیر کسی مرد کے جنسی تعلقات کو جرم مانا جاتا تھا، آئین کے منافی ہے۔ دو بالغوں کے درمیان جنسی تعلق، بشرطیکہ اس میں دونوں کی مرضی شامل ہو، جرم نہیں مانا جائے گا، چاہے وہ دونوں شادی شدہ ہی کیوں نہ ہوں۔... عورت کو مرد کی ملکیت نہیں مانا جاسکتا اور آج کے دور میں اس طرح کے فرسودہ قانون کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

پانچ رکنی بنچ نے کہا کہ یہ قانون دستور کے آرٹیکل ۱۴ اور ۲۱ کے منافی ہے جو زندگی، آزادی اور مساوات کے حق کی ضمانت دیتے ہیں۔ سپریم کورٹ میں بحث اس سوال پر تھی کہ کیا شادی کے بعد بیوی شوہر کی املاک یا جاگیر بن جاتی ہے؟ اور اگر شادی شدہ عورت سے زنا جرم ہے، تو سزا صرف مرد کو ہی کیوں ملے، دونوں کو کیوں نہیں؟ لیکن عدالت نے کہا کہ

"عورت اور مرد کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی اور دونوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ بنچ میں شامل واحد خاتون جج جسٹس اندو ملہوترا نے کہا کہ زنا اخلاقی طور پر غلط ہے لیکن جسٹس چندر چور نے کہا کہ شادی کے بعد مرد اور عورت اپنی 'جنسی خود مختاری' ایک دوسرے کے پاس گروی نہیں رکھ دیتے۔"[1]

یہی فیصلہ جرمنی کے اُردو خبر رساں ادارے ڈوئچے ویلے نے یوں رپورٹ کیا:

"غیر ازدواجی تعلقات کو مجرمانہ نقطہ نظر سے دیکھنا رجعت پسندانہ قدم ہے۔"

"غیر ازدواجی تعلقات بالغ لوگوں کے درمیان ذاتی معاملہ ہے۔"[2]

ڈیڑھ صدی پرانے قانون کے تحت اگر کوئی مرد کسی شادی شدہ عورت کے اس کے شوہر کی اجازت کے بغیر ہم بستری کرتا ہے تو وہ 'بدکاری' کا مرتکب ہوتا ہے جس کی سزا پانچ برس جیل مقرر تھی۔ عدالت نے کہا کہ

"یہ قانون خواتین کو وقار اور ذاتی انتخاب کے حق سے محروم کرتے ہوئے "صرف شوہر کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ خواتین کو بطور منقولہ مال کے طور پر استعمال کر سکے۔" سپریم کورٹ کے جسٹس ڈی وائی چندراچڈ نے کہا، "یہ ہر خاتون کو حاصل جنسی خود مختاری کو نظر انداز کرتا ہے اور شادی کے بندھن میں عورت کو مختاری سے محروم کرتا ہے... وہ صرف اپنے شوہر کی مرضی کے تابع ہوتی ہے۔"

☆ ۲۰۱۴ء میں ایک دلی کے سیشن جج وریندر بھٹ نے اپنے فیصلے میں قرار دیا تھا کہ

"مرضی سے قائم کیے گئے غیر ازدواجی تعلقات کو ریپ (جبری زنا) قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تاہم اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ غیر ازدواجی جنسی تعلقات 'غیر اخلاقی' اور 'ہر مذہب' کی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ کسی شخص کے فعل کو صرف اس وجہ سے ریپ قرار نہیں دیا جاسکتا کہ اس نے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب ایک بالغ، تعلیم یافتہ اور دفتر میں کام کرنے والی خاتون جنسی تعلق پر تیار ہو جاتی

---

1 https://www.bbc.com/urdu/regional-45662163

2 https://www.dw.com/ur/a-45659048

ہے تو اس نے اپنے آپ کو خود خطرے میں ڈالا ہے۔ جج کا کہنا تھا کہ ایک تعلیم یافتہ خاتون کو صرف شادی کے وعدے پر ہی جنسی تعلق قائم نہیں کر لینا چاہیے۔"[1]

مذکورہ فیصلے اور ان میں پیش کئے جانے والے استدلال سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ترقی، صنفی مساوات، آزادی اور انسانی حقوق کے خوبصورت الفاظ کے حقیقی معانی کیا ہیں، اور ان سے سماج اور مذہب مخالف اقدامات کے سلسلے میں کس طرح کام لیا جا سکتا ہے۔

اسلام نے نکاح کے بغیر ازدواجی تعلق کو نہ صرف اکبر الکبائر قرار دیا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کو کسی مرد و عورت کے ناجائز تعلق پر روئے کائنات میں سب سے زیادہ غیرت و غصہ آتا ہے۔ اور اس جرم کی سزا اسلام سمیت یہودویت و نصرانیت اور دیگر مذاہب میں بدترین مقرر کی گئی ہے۔ جیسے اب رجعت پسندی اور دقیانوسیت کی گالی دے کر ترقی اور صنفی مساوات کے انسانی حق کے نام پر معاشرے میں پروان چڑھایا جائے گا۔

اب تک شادی کے بعد زوجین کے ایک دوسرے پر خصوصی استحقاق حاصل تھا، اور اسلام میں اس کے لئے لعان کا خصوصی قانون موجود ہے، لیکن انسانی حقوق کے علم برداروں نے 'کیا عورت مرد کی غلام ہے؟' جیسے بہانے لگا کر، اس کو بھی ختم کر دیا اور اس طرح عملاً شادی، نسل و نسب اور عفت و عصمت کے تقاضوں کو معاشرے سے منانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ہے انسانی حقوق، ترقی، روشن خیالی کی معراج اور ہمیں اس کے تناظر میں مسلم معاشروں میں انسانی حقوق کا چہرہ جان اور پہچان لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

③ **معابد و مساجد کا تقدس پامال کرنے میں انسانی حقوق کا کردار:** انسانی حقوق کے نام پر پھیلائے جانے والی سرکشی کی ایک اور مثال بھی بھارت کے سپریم کورٹ کی ہی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔ یاد رہے کہ یہ سب فیصلے ان انسانی حقوق کی سند پر کئے گئے ہیں جو اقوام متحدہ کے زیر سایہ تمام جدید ریاستوں کے لازمی دستور کا اولین اور لازمی حصہ ہوتا ہے۔ فیصلہ کی طرف آیئے، خواتین کے بعض ایام حیض کی حالت میں گزرتے ہیں، جس میں سماجی معمولات کو برقرار رکھتے ہوئے، خواتین کو عبادت گاہوں میں آنے سے منع کیا جاتا ہے، لیکن حال ہی میں بھارتی سپریم کورٹ نے انسانی حقوق کے نام پر اس مسلمہ اُصول کو بھی پامال کر دیا۔ انڈیا میں خواتین کو ناپاکی کی حالت میں مذہبی رسومات میں حصہ لینے یا مندروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی کیونکہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق انھیں اس حالت میں 'ناپاک' سمجھا جاتا ہے۔

---

1 https://www.dw.com/ur/a-17344057

درخواست دہندگان نے دلیل دی کہ یہ روایت انڈیا کے آئین میں دی گئی صنفی مساوات کی خلاف ورزی ہے۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس دیپک مشرا نے اپنے فیصلے میں کہا 'مذہب ایک وقار اور شناخت کے لیے ہے۔' انھوں نے مزید کہا: "مذہب پر عمل کرنے کا حق مرد اور عورت دونوں کا ہے۔"[1]

یاد رہے کہ انسانی حقوق کے نام پر صنفی مساوات کا بھارتی قانون پاکستان میں بھی ان الفاظ کے ساتھ دستور کی زینت ہے، جس کا آئینی اطلاق ابھی مزید معاشرتی والحادی ترقی کا منتظر ہے:

"آرٹیکل ۲۵: (۱) تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہیں، اور قانونی تحفظ کے مساوی طور پر حق دار ہیں۔
(۲) جنس کی بنا پر کوئی امتیاز نہیں کیا جائے گا۔"[2]

انسانی حقوق کے دعوے صنفی مساوات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، انڈیا اور پاکستان کی مشترکہ قانونی بنیاد انسانی حقوق کے تحت، قرین قیاس ہے کہ پاکستان میں بھی خواتین حالتِ حیض میں مساجد میں جانے یا ان میں امامت اور خطابت کا موقع نہ دیے جانے کو چیلنج کر دیں، اور انسانی حقوق کے دعویدار، اقوام متحدہ کی ایمنسٹی انٹرنیشنل ان کی مدد کے لئے پیچھے موجود ہوں، امریکی امداد کو اس سے مشروط کر دیا جائے۔ اور عدالتیں انسانی حقوق کے نام پر اس کو سندِ جواز دیں، اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت اگر ایسے اقدام کو خلاف اسلام قرار بھی دیں تو اسمبلیاں اور گورنر قومی مصلحت کے دباؤ کے تحت ان کی سفارشات جاری ہی نہ کریں۔

④ انسانی حقوق؛ قحبہ گری اور جسم فروشی کے دعویدار: شیطانی شہوات اور نفسانی خواہشات کے لئے الاپا جانے والا انسانی حقوق کا مغربی راگ، ایک انسان کی عقل یوں مفلوج کر دیتا ہے کہ وہ انسانی تاریخ کے ان مسلمہ جرائم کی ایسی حیاباختہ توجیہات کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جس سے انسانیت شرمندہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان دنوں دہریت اور اسلام دشمنی کے مرکز ہالینڈ کے دار الحکومت ایمسٹرڈیم میں عورت کی جسم فروشی پر پارلیمنٹ میں گرما گرم بحث جاری ہے۔ یہ وہی شہر ہے جو اس فحاشی کا سب سے بڑا عالمی مرکز ہے اور یہاں کا ریڈ لائٹ ایریا بنتِ حوا کی ارزانیت کا مظہر ہے۔ عورت کو دیکھنے کو 'گھورنا'، اس کی مرضی کے خلاف چھونے کو 'ہراساں کرنا'، اس کے استحصال پر 'می ٹو' Me Too کے نام سے مزاحمانہ جدوجہد کرنے والا حقوق پرست، اس عورت کی جسم فروشی کو اس کا انسانی حق قرار دیتا ہے۔

---

1 https://www.bbc.com/urdu/regional-45679680 (۲۹ ستمبر ۲۰۱۸ء)

۲ دستورِ پاکستان ۲۰۱۵ء، مجریہ قومی اسمبلی پاکستان: ص ۱۴

۱۹۷۰ سے رقم کے عوض بدکاری کو عورت کا حق قرار دینے والے ہالینڈ میں ۴۶ ہزار دستخطوں کی مدد سے ایسا عوامی بل پیش کر کے قومی بحث کا آغاز کیا گیا ہے، جس میں یہ کہہ کر اس حرام کاری کو بند کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ ''اگر یہ آپ کی بہن ہوتی!'' اور یہ کہ ''بدکاری عورت کا بدترین استحصال ہے، اس سے جرائم اور بیماریوں کو فروغ ملتا ہے۔'' اس کے مقابلے میں انسانی حقوق کے دعویدار کبھی اسے 'کام کے تحفظ کا حق'، 'میرا جسم، میری زندگی' کے حقوق لے آتے ہیں اور کبھی ایسے بہانے پیش کرتے ہیں کہ اس طرح بدکار عورت کو پولیس اور نگران اداروں کو بھی فیس دینا پڑے گی، جس سے ان کی کمائی کے حق میں خلل آئے گا۔ یہ مباحثہ ایسے شرم ناک پہلوؤں سے مسلسل بحث کرتا ہے جس کی کسی مریض شخص سے ہی توقع کی جاسکتی ہے، عالمی خبر رساں ادارہ بی بی سی، لندن لکھتا ہے کہ

''ان ونوں ولندیزی پارلیمان، ہالینڈ میں جسم فروشی کی قانونی حیثیت پر بحث کی تیاری کر رہی ہے۔ اس صنعت کو دائیں بازوں کے مسیحیوں اور بائیں بازو کی فیمینسٹ خواتین کی طرف سے مخالفت کا سامنا ہے اور ریڈ لائٹ ڈسٹرکٹ میں جسم فروشی کا کام کرنے والی خواتین کو اپنے کام کے حق کے تحفظ کے لیے دباؤ کا سامنا ہے۔''[1]

⑤ **سید المرسلین ﷺ کی توہین پر مصر انسانی حقوقیے اور مغربی اقوام:** مغرب کا حقوق پرست انسان، انسانیت کے محسن اعظم محمد ﷺ کی توہین کا حق لینے کے لئے بھی مصر ہے۔ انسانی حقوق کے نام پر سید المرسلین ﷺ کی توہین، اس قدر تکرار، اصرار، ڈھٹائی اور تنوع کے ساتھ کی جارہی ہے کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ مغرب کے چند بیمار لوگوں کی ذہنیت ہے، لیکن حالیہ سالوں میں مغرب کے تہذیبی مرکز پیرس میں چارلی ایبڈو نامی فرانسیسی اخبار میں توہین آمیز خاکوں کے حوالے سے ہونے والا کثیر القومی مظاہرہ اس مغالطہ کی حیثیت کھول دیتا ہے۔ بی بی سی کے مطابق:

''فرانسیسی عوام نے پیرس کی تاریخ کے سب سے بڑے اجتماع میں شرکت کی جس میں اظہارِ یکجہتی کے لیے ۴۰ ممالک کے سربراہان شریک ہوئے۔ ۱۱ جنوری ۲۰۱۵ کو نکالی جانے والی اس ریلی میں ایک اندازے کے مطابق تیس لاکھ سے زیادہ افراد نے شرکت کی جن میں برطانوی وزیراعظم، جرمن چانسلر انجیلا میرکل، فلسطینی صدر محمود عباس، مالی کے صدر ابراہیم بابوچر کیتا، یورپی یونین کے صدر ڈونلڈ ٹسک،

1 https://www.bbc.com/urdu/vert-cap-48033777

اُردن کے شاہ عبداللہ اور ان کی اہلیہ رانیہ اور اسرائیلی وزیر اعظم بنیامن نتن یاہو سمیت کئی ممالک کے سربراہان شریک ہوئے۔ اس موقعے پر فرانس کے صدر فرانسواں اولاند کا کہنا تھا کہ 'آج پیرس دنیا کے دارالحکومت کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ آج ہمارا سارا ملک اٹھ کھڑا ہو گا۔'

فرانس کے کئی دوسرے شہروں میں بھی اسی طرح کی ریلیاں نکالی گئیں جن میں وزارتِ داخلہ کے مطابق ۳۷ لاکھ کے قریب افراد نے شرکی جن میں سے ۱۶ لاکھ کے قریب افراد پیرس کی ریلی میں شریک ہوئے۔ پیرس کی ریلی کے آغاز پر عالمی رہنماؤں نے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی۔

چالیس ملکوں کے سربراہان کی سکیورٹی کے لیے پیرس میں دو ہزار پولیس اہلکار جبکہ ۱۳۵۰ فوجی تعینات کیے گئے جن میں چھتوں پر ماہر نشانہ باز بھی موجود تھے۔

پیرس میں نکالی جانے والی ریلیوں میں شریک افراد آزادی اور چارلی کے نعرے لگا رہے تھے اور بعض فرانسیسی پرچم لہرا رہے تھے اور قومی ترانے گا رہے تھے۔"[1]

مغربی میڈیا کی ایک اور خبر کے مطابق

"پیرس کے میگزین پر حملے کے پس منظر میں جرمنی کے شہر ڈریزڈن میں یورپ کی اسلامائزیشن کے خلاف جلوس نکالا گیا جس میں ریکارڈ تعداد میں لوگوں نے حصہ لیا۔ اس احتجاجی مظاہرے کو پیگیڈا (مغرب کی اسلامائزیشن کے خلاف محبِ وطن یورپی) نامی تنظیم نے منعقد کیا تھا اور اس میں سیاسی جماعتوں کی تلقین کے باوجود ریکارڈ ۲۵ ہزار لوگوں نے شرکت کی۔ جلوس کے شرکا نے ہاتھوں میں بینر اٹھا رکھے تھے جن پر فرانسیسی کارٹون نگاروں کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کیا گیا تھا۔"[2]

حال ہی میں یورپی یونین کی عدالت نے توہین رسالت کو آزادی کا حق قرار دینے کی مخالفت کی ہے، لیکن سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین اور دیگر بد طینت شاتمانِ رسول کی مدد، ڈنمارک و ہالینڈ کے صحافی اور وزرا کے ساتھ اظہار یک جہتی اور ان کی حکومتی تائید و تحفظ یہ بتاتا ہے کہ مغرب کے حقوق پرست انسان کو دوسروں کی عزت سیکھنے کے لئے ابھی بہت عرصہ درکار ہے۔ اور انسانی حقوق کے عالمی چارٹر کا یہ آرٹیکل اس کی حوصلہ افزائی اور تحفظ کرنے کے لئے ان کی پشت پر موجود ہے:

---

1 https://www.bbc.com/urdu/world/2015/01/150112_france_president_security_meeting_rh

2 https://www.bbc.com/urdu/world/2015/01/150112_germany_anti_islamization_rally_zis

Article 19: Everyone has the right to freedom of opinion and expression; this right includes freedom to hold opinions without interference and to seek, receive and impart information and ideas through any media and regardless of frontiers.

”ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے، اور جس ذریعے سے چاہے، بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیے، علم اور خیالات کی تلاش کرے۔ انہیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے۔“

⑥ **رب ذوالجلال اور والدین پر اعتراض کا حق:** نفس پرست انسان اپنے انسانی حق کے بارے میں یہاں تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ اپنے خالق پر اعتراض کرتا، والدین کو نشانہ بناتا اور انسانیت کے خاتمے کی بات کرتا ہے، چنانچہ بھارت میں ایک شخص نے اپنے والدین پر یہ کیس دائر کر دیا:

’مجھے کیوں پیدا کیا؟‘... انڈیا کے ۲۷ سالہ نوجوان نے اپنے والدین کے خلاف اسے بغیر اجازت پیدا کرنے پر ہرجانے کا دعویٰ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ممبئی سے تعلق رکھنے والے رافیل سیموئیل نے کہا کہ والدین کا بچے پیدا کرنے کا عمل بالکل غلط ہے کیونکہ پھر ان بچوں کو زندگی بھر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ سمجھتا ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے پیدا کرنے کی اجازت تو نہیں لی جا سکتی لیکن پھر بھی وہ مصر ہے کہ ’پیدا ہونے کا فیصلہ ہمارا نہیں تھا۔‘ اور کیونکہ ہم اپنی مرضی کے بغیر پیدا ہوئے ہیں تو ہمیں زندگی گزارنے کے لیے پیسے دیے جائیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کا اگر خاتمہ ہو جائے تو یہ زمین کے لیے بہت سود مند ثابت ہو گا۔ 'انسانی زندگی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اتنے لوگ تکلیف میں ہیں۔ اگر ہم یہاں نہ ہوں تو زمین کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ جانور خوش ہوں گے اور کیونکہ کوئی انسان ہی نہیں ہو گا تو کسی کو تکلیف بھی نہیں ہو گی۔

رافیل سیموئیل کی ماں کویتا کرناد کی جانب سے کہا گیا ہے کہ 'ہمیں اپنے بیٹے کی ہمت پر ناز ہے کہ اس نے ہمیں عدالت لے جانے کی دھمکی دی، یہ بات جانتے ہوئے کہ ہم دونوں وکیل ہیں۔ اگر وہ کوئی جائز اور ذہانت بھرا نکتے پیش کریں گے تو میں اپنی غلطی مان لوں گی۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر اتنا بہادر اور آزادانہ سوچ رکھنے والا شخص بنا ہے۔“[1]

1 https://www.bbc.com/urdu/regional-47161970

یہ ہے اس آزادی اور انسانی حق کی معراج، جو انسان کو اس تباہ کن سوچ تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ والدین پر اعتراض کرتا اور انسانیت کے خاتمے کی بات کہنا بھی اپنا حق سمجھتا ہے۔

⑦ ماں کے اپنی اولاد سے تعلق اور ممتا کے جذبہ قربانی کی مثال دی جاتی ہے، لیکن جب مذہب کو چھوڑ کر اپنے بنیادی حقوق کی طرف توجہ زیادہ مرکوز ہو جائے تو بعض مائیں اپنی اولاد کو قتل تک کر ڈالتی ہیں۔ مذہب کی نفی کرنے والے کمیونزم کے مرکز روسی شہر ماسکو میں ایسی ماؤں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے جو اپنی ہی اولاد کی جان لے لیتی ہیں:

"فیلیسائڈ نامی جرم یعنی ماں کا اپنے بچے کو قتل کرنا کی دو اقسام ہیں جن میں سے ایک کو نیونیٹیسائڈ کہتے ہیں یعنی جب ماں ایک نوزائیدہ بچے کو قتل کرتی ہے اور دوسری کو انفینٹیسائڈ کہتے ہیں یعنی جب ماں وہ سال سے کم عمر بچے کو مارتی ہے۔ روس کی عدالتوں میں ۲۰۱۸ء میں ایسے ۳۳ مقدمات کی سماعت کی گئی تھی۔ ماہرین یہ مانتے ہیں کہ اس سے آٹھ گنا زیادہ معاملات ایسے ہیں جو کبھی عدالت تک نہیں پہنچتے۔ فورینزک ماہر نفسیات اور ماسکو میں طبِ نفسی کے ادارے سربسکی انسٹیٹیوٹ میں تحقیق کرنے والی مارگریٹا کچیوا کا کہنا ہے کہ ہمارے ہسپتال میں ۲۰ میں سے تین یا چار ایسی خواتین ہوتی ہیں جنھوں نے اپنے بچوں کو قتل کیا ہوتا ہے۔

روس کے ماہرین جرائم کہتے ہیں کہ ۸۰ فیصد خواتین اپنے بچے کو مارنے سے پہلے ڈاکٹر کے پاس جاتی ہیں اور کم خوابی، سر درد اور حیض کی بے قاعدگی کے بارے میں شکایت کرتی ہیں۔

امریکہ کی طرح روس میں بھی عدالتیں یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ ایسی ماؤں کو کس قسم کی سزا دی جائے جو اپنے بچوں کو قتل کر دیتی ہیں۔ اگر فورینزک ماہر نفسیات ان ماؤں کو پاگل قرار نہیں دیتے تو انھیں ایک لمبا عرصہ جیلوں میں گزارنا پڑتا ہے۔"[1]

⑧ قادیانیوں کا دھوکہ دہی کا حق: قادیانیوں نے لمبے عرصہ سے انسانی حقوق کو اپنے استدلال کا محور اور قانونی پیش قدمی کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ جب قادیانی پاکستان میں اسلام کے نام کو اپنے بناوٹی اور جعلی مذہب کے لئے استعمال کرتے ہیں تو یہی بنیادی انسانی حقوق ایک طرف انہیں ارتداد کا حق دیتے ہیں، اور دوسری طرف مذہبی اصطلاحات میں مغالطہ آرائی کا۔ اور یہ دونوں حقوق، آزادئ اظہار اور آزادئ رائے کے تحت آتے

1 https://www.bbc.com/urdu/science-49013189

ہیں۔ چنانچہ جب پاکستان میں ان کو اسلامی شعائر استہزال کرنے پر سزا دی جاتی اور ان کو اپنے تشخص کا پابند کیا جاتا ہے تو مغرب اور اس کی ساری تنظیمیں ان کی پشت پر کھڑی نظر آتی ہیں۔ 'توہین رسالت کے قانون: ۲۹۵ سی' کی مذمت میں بھی یہی آزادئ مذہب اور آزادئ اظہار کا مغربی انسانی حق کار فرما ہے۔

اور جب حدود اللہ کے نفاذ کے لئے مجرموں کو قرآنی حکم کے مطابق علانیہ اور جسمانی سزا دینے کی بات کی جاتی ہے تو مغرب اپنے فکری تحکم کے نام پر ان کو وحشیانہ اور سنگین سزائیں قرار دے دیتا ہے۔ اگر اسلام کی رو سے باکسنگ کے کھیل کو انسانی چہرے کو نشانہ بنانے کی بنا پر وحشیانہ قرار دے کر ناجائز بتایا جائے تو یہی اہل مغرب اس وحشت بھرے کھیل کو ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ کھیل میں وحشیانہ پن جائز اور کسی انسان پر زیادتی کی پاداش میں ہو تو ناجائز ٹھہرے۔ یہ سب انسانی حقوق اور مادر پدر آزادی کے ہی تو کرشمے ہیں جو عبدیت وبندگی کے مقابل سرکشی اور من مانی کے استعارے ہیں!!

اوپر مذکور انسانی حقوق کے نام پر مچائے جانے والے فسادات میں کونسی ایسی انسانی ضرورت ہے، جس کے لئے انسانی حقوق کا معتبر لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ سب تو نری خواہشات اور بیمار ذہنیت کے تقاضے ہیں، جن میں نہ تو انسانیت ہے اور نہ ہی حقوقیت۔ دراصل ان خواہش پرستیوں اور شہوت رانیوں کے لئے درست لفظ جاہلیت جدیدہ ہے جو جاہلیتِ قدیمہ کی طرح نت نئے بہانے اور دعوے لے کر خاندان ومعاشرہ، تہذیب وملت اور دنیا وآخرت کو تباہ کرنے پر مصر ہے۔

مسلم ممالک میں مغربیت واباحیت، الحاد ودہریت اور فحاشی وعریانیت کے فروغ کی بیشتر جدوجہد فی زمانہ انسانی کے کارکنوں، اداروں اور نعروں کے تحت ہو رہی ہے۔ جہاں انسانی حقوق کے قائدین کی دین بیزاری ان کی شخصی رجحانات اور اقدامات سے بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے۔ ماضی میں عاصمہ جہانگیر کی قبیل کے انسانی حقوق کے نام لیوا جس طرح اسلام اور علمائے کرام کو نشانے پر رکھتے رہے ہیں، اس سے بھی انسانی حقوق کے مزاج اور رجحان کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ میڈیا اور عدالتوں کے ذریعے ان کو پھیلایا جا رہا ہے۔

جب کوئی اصطلاح خوبصورت لباس میں گناہ وحرام کے فروغ کا باعث بن رہی ہو تو اہل علم ودانش کو اسے ترک کر کے ایسے واضح الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جس سے کفر وباطل کے راستے مسدود ہو جائیں اور خیر وحق کا بول بالا ہو۔ یہی سلامت روی اور انصاف کا تقاضا ہے!! (ڈاکٹر حافظ حسن مدنی)

طلاق کے ضروری مسائل واقسام

تفسیر اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ یعنی "طلاق دو مرتبہ ہے!"

حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ

وہ طلاق جس میں خاوند کو (عدت کے اندر) رجوع کا حق حاصل ہے، وہ دو مرتبہ ہے۔ پہلی مرتبہ طلاق کے بعد بھی اور دوسری مرتبہ طلاق کے بعد بھی رجوع ہو سکتا ہے۔ تیسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد رجوع کی اجازت نہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ حق طلاق ورجوع غیر محدود تھا جس سے عورتوں پر بڑا ظلم ہوتا تھا۔ آدمی بار بار طلاق دے کر رجوع کرتا رہتا تھا۔ اس طرح سے اسے نہ بساتا تھا، نہ آزاد کرتا تھا۔ اللہ نے اس ظلم کا راستہ بند کر دیا۔ اور پہلی یا دوسری مرتبہ سوچنے اور غور کرنے کی سہولت سے محروم بھی نہیں کیا۔ ورنہ اگر پہلی مرتبہ کی طلاق میں ہی ہمیشہ کے لیے جدائی کا حکم دے دیا جاتا تو اس سے پیدا ہونے والی معاشرتی مسائل کی پیچیدگیوں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے طلقتان (دو طلاقیں) نہیں فرمایا، بلکہ ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ﴾ طلاق دو مرتبہ فرمایا، جس سے اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ بیک وقت دو یا تین طلاقیں دینا اور انہیں بیک وقت نافذ کر دینا حکمتِ الٰہیہ کے خلاف ہے۔ حکمتِ الٰہیہ اس بات کی مقتضی ہے کہ ایک مرتبہ طلاق کے بعد (چاہے وہ ایک ہو یا کئی ایک) اور اس طرح دوسری مرتبہ طلاق کے بعد (چاہے وہ ایک ہو یا کئی ایک) مرد کو سوچنے سمجھنے اور جلد بازی یا غصے میں کئے گئے کام کے ازالے کا موقع دیا جائے۔ یہ حکمت ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاقِ رجعی قرار دینے میں ہی باقی رہتی ہے جیسا کہ اہل حدیث کا مذہب ہے، نہ کہ تینوں کو بیک وقت نافذ کر کے سوچنے اور غلطی کا ازالہ کرنے کی سہولت سے محروم کر دینے کی صورت میں جیسا کہ بعض لوگوں کا اصرار ہے۔

طلاق دینے کا صحیح طریقہ اور غلط طریقے سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کا حل

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں طلاق دینے کا وہ صحیح طریقہ بھی بیان کر دیا جائے جو شریعت میں پسندیدہ ہے اور غلط طریقے سے یعنی ایک ہی مجلس میں بیک وقت تین طلاقیں دینے سے جو معاشرتی مسائل اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کا صحیح حل بھی عرض گزار کر دیا جائے، تاکہ عوام مشکلات سے بچ جائیں۔

طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ حالتِ طہر میں بیوی سے صحبت کیے بغیر صرف ایک طلاق دی جائے، اور

وہ بھی صرف اس صورت میں کہ اس کے بغیر چارہ نہ ہو۔ اس کے بعد اگر رجوع اور صلح کی صورت بن جائے تو محدثین اور فقہاے اربعہ سب کے نزدیک تین حیض یا تین مہینے کے اندر رجوع اور عدت گزر جانے کے بعد دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے اور اگر طلاق دینے کے بعد رجوع نہ ہو اور عدت (تین حیض) گزر جائے تو ان کے مابین تعلق زوجیت ختم ہو جائے گا۔ مطلقہ بیوی اس کے بعد آزاد ہے جہاں چاہے نکاح کرے، حتیٰ کہ پہلے خاوند سے بھی نکاح کر سکتی ہے۔ اس طریقے میں دوسری اور تیسری طلاق دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ اور موٹی سی بات ہے کہ جب ایک مرتبہ ہی طلاق دینے سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو بیک وقت تین طلاقیں کیوں دی جائیں؟ لیکن ہمارے ملک میں جہالت عام ہے، حتیٰ کہ وکلا اور عرضی نویس حضرات بھی بے علم ہیں اور جس طرح جاہل لوگ بے سوچے سمجھے ایک ہی سانس میں تین طلاقیں دے دیتے ہیں، اگر کوئی وکیل یا وثیقہ نویس سے طلاق لکھواتا ہے تو وہ بھی تین طلاقیں لکھ کر اسے دے دیتے ہیں۔ حالانکہ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ تین طلاقیں دینے پر شدید غصے کا اظہار فرمایا ہے اور اسے اللہ کی کتاب کے ساتھ استہزا اور مذاق قرار دیا ہے۔ (اس کی سند میں اگرچہ ضعف ہے لیکن دیگر احادیث اس مفہوم کی مؤید ہیں) اور اسی غلط طریقے کی وجہ سے پھر اختلاف بھی واقع ہوتا ہے۔

کچھ علماء کہتے ہیں کہ اس طرح تینوں طلاقیں واقع ہو گئی ہیں اور اب حلالہ کے سوا کوئی چارہ نہیں، اس کے بغیر دونوں کا دوبارہ نکاح نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ حلالے کا کوئی تصور اسلام میں نہیں ہے، یہ ایک لعنتی فعل ہے جسے کوئی غیرت مند مرد اور عورت برداشت نہیں کر سکتی اور نبی ﷺ نے حلالہ کرنے والے اور کروانے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے: «لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الْمُحِلَّ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ»[1]۔ اور حلالہ کرنے والے کو التَّيْسِ الْمُسْتَعَارِ "کرائے کا سانڈ" کہا ہے۔

اس کے برعکس دوسرے علماء کا موقف یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی طلاقِ رجعی شمار ہوں گی، یعنی اس کے بعد خاوند اگر رجوع کرنا چاہے تو وہ تین مہینے کی عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے، اس کے لیے اسے نکاح کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر عدت گزرنے کے بعد صلح کرنا چاہیں گے تو پھر نکاح ضروری ہے اور حلالے کے بغیر ان کا باہم نکاح کرنا جائز ہو گا۔ پہلی مرتبہ اور دوسری مرتبہ طلاق میں یہی حکم ہو گا۔ البتہ

---

۱ صحیح الجامع الصغیر حدیث: ۵۱۰۱، جامع ترمذی حدیث ۱۱۲۰

۲ ابن ماجه، کتاب النکاح، باب المحلل والمحلل له، حدیث: ۱۹۳۶ (شیخ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

تیسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد نہ رجوع ہو سکتا ہے اور نہ نکاح ﴿حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ ”جب تک کہ وہ کسی اور جگہ نکاح نہ کرے۔“ اس موقف کے دلائل حسب ذیل ہیں:

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾ (البقرۃ۲:۲۲۹)

”طلاق دو مرتبہ ہے، پس (اس کے بعد) بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا۔“

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو طلاق دینے کے بعد بیوی سے رجوع کر کے اپنے پاس روک لینے یا طلاق کو مؤثر کر کے احسان کے ساتھ اسے اپنے سے جدا کر دینے کا دو مرتبہ حق حاصل ہے۔ یعنی پہلی اور دوسری طلاق، طلاقِ رجعی ہے جس میں خاوند کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق شرعی طور پر حاصل ہے۔ البتہ تیسری طلاق کے بعد یہ حق نہیں۔ تیسری طلاق کے بعد بیوی ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتی ہے، اس سے رجوع ہو سکتا ہے نہ نکاح۔ یہاں تک کہ وہ کسی اور شخص سے آباد ہونے کی نیت سے باقاعدہ نکاح کرے۔ پھر وہ اپنی مرضی سے اسے طلاق دے دے یا فوت ہو جائے، تو پہلے خاوند سے اس کا دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم کے اس اندازِ بیان سے صاف واضح ہے کہ ایک ہی مرتبہ تین طلاقیں دینا یا ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین شمار کر کے بیوی کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دینا، قرآن کے مذکورہ حکم سے متصادم ہے۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ پہلی اور دوسری طلاق کے بعد سوچنے اور نظرِ ثانی کا موقع اور گنجائش باقی ہے۔ لیکن لوگ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین ہی شمار کر کے اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے موقع اور گنجائش کو ختم کر دیتے ہیں جو کسی لحاظ سے بھی صحیح اور مستحسن نہیں، کیونکہ اس طرح وہ حکمت فوت ہو جاتی ہے جو پہلی اور دوسری طلاق کے بعد رجوع کرنے کی گنجائش میں مضمر ہے۔ اس لیے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک ہی طلاقِ رجعی شمار کرنا، جس کے بعد عدت کے اندر خاوند کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہو، قرآن کریم کی رو سے زیادہ صحیح ہے اور ذیل کی احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

① عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: "طَلَّقَ رُكَانَةُ بْنُ عَبْدِ يَزِيدَ أَخُو بَنِي الْمُطَّلِبِ امْرَأَتَهُ ثَلَاثًا فِي مَجْلِسٍ وَاحِدٍ، فَحَزِنَ عَلَيْهَا حُزْنًا شَدِيدًا، قَالَ: فَسَأَلَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «كَيْفَ طَلَّقْتَهَا؟» قَالَ: طَلَّقْتُهَا ثَلَاثًا، قَالَ: فَقَالَ: «فِي مَجْلِسٍ وَاحِدٍ؟» قَالَ: نَعَمْ قَالَ: «فَإِنَّمَا تِلْكَ وَاحِدَةٌ

فَأَرْجِعْهَا إِنْ شِئْتَ» قَالَ: فَرَجَعَهَا [1]

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دیں، لیکن بعد میں سخت غمگین ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم نے اسے کس طرح طلاق دی تھی؟ انہوں نے کہا: 'تین مرتبہ'۔ آپ نے پوچھا: "ایک ہی مجلس میں طلاقیں دی تھیں؟" انہوں نے کہا: "ہاں" آپ نے فرمایا: "پھر یہ ایک طلاق ہوئی ہے، اگر تم چاہو تو رجوع کر سکتے ہو۔ راوئ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ اس کے بعد حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سے رجوع کر لیا۔"

② عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: "كَانَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، وَأَبِي بَكْرٍ، وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ، طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً [2]

"عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عہدِ رسالت مآب اور عہد ابو بکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر فاورق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں تک ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھیں۔"

(ان دونوں حدیثوں سے بھی واضح ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی طلاق رجعی شمار ہو گی) ۔

ان ہی مذکورہ تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق شمار کر کے خاوند کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا اور عدت گزرنے کے بعد بہ نکاح جدید (بغیر حلالہ مروجہ کے) اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے گھر بسانے کا حق حاصل ہے۔ جیسے مولانا سعید احمد اکبر آبادی (مدیر ماہنامہ 'برہان' دہلی)، مولانا عبد الحلیم قاسمی (جامعہ حنفیہ، گلبرگ، لاہور)، مولانا پیر کرم شاہ ازہری (دار العلوم محمدیہ، بھیرہ)، مولانا حسین علی (واں بھچراں)، حکیم محمد یٰسین (جھنگ، متوفی ۱۹۹۹ء) اور دیگر حضرات ہیں۔ جس کی تفصیل 'ایک مجلس کی تین طلاقیں' نامی کتاب اور راقم کی کتاب 'ایک مجلس کی تین طلاقیں اور اس کا حل' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اوّل الذکر کتاب میں پیر کرم شاہ کا ایک مدلل مقالہ بھی شامل ہے، جس میں اسی مسلک کی تائید کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی سے پوچھا گیا کہ زید نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ لیکن زید

---

۱ مسند احمد بن حنبل: ۲۳۸۷۔ شیخ البانی کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند کو امام احمد، حاکم، ذہبی نے صحیح، امام ترمذی نے حسن (زیر حدیث ۹۱۲۱)، امام ابن تیمیہ نے جید (مجموع فتاوی: ۱۸/۳)، اور حافظ ابن حجر نے صحیح ہونے کو راجح قرار (فتح الباری: ۳۱۶/۹) دیا ہے۔ (ارواء الغلیل: ۱۴۵/۷)

۲ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب الطلاق الثلاث، حدیث ۱۴۷۲

کو اپنی بیوی سے نہایت اُلفت ہے اور مفارقت ناقابل برداشت، تو بدرجۂ مجبوری مذہبِ شافعی کی تقلید کرتے ہوئے نکاح جائز ہوگا یا نہیں؟ اس کے جواب میں مولانا عبدالحی مرحوم نے فرمایا:

"ضرورتِ شدیدہ کے وقت مذہبِ شافعی کی تقلید کرنا جائز ہے۔"[1]

مطلب مولانا عبدالحی مرحوم کا یہ ہے کہ اگر مفاسد کا اندیشہ ہو تو دوسرے مذہب کے فتوے کے مطابق رجوع یا نکاح کر کے اپنا گھر آباد کر لیا جائے۔ یہی اجازت مولانا کفایت اللہ مرحوم (مفتی اعظم ہند) نے مخصوص حالات کے لیے دی ہے۔ چنانچہ ان کے مجموعہ فتاویٰ میں ایک سوال جواب درج ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک حنفی نے طلاقِ ثلاثہ کے بعد اہل حدیث عالم سے فتویٰ لے کر اپنی بیوی سے رجوع کر لیا۔ جس پر دوسرے علماء نے اہل حدیث مفتی پر کفر کا فتوی لگا دیا اور اس کے مقاطعے کا حکم دیا اور مسجد میں آنے سے روک دیا۔ (سوال کیا گیا کہ) کیا یہ فعل جائز ہے؟ اس کا جواب دیا گیا:

"ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے سے تینوں طلاقیں پڑ جانے کا مذہب جمہور علماء کا ہے اور ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں۔ جمہور علماء اور ائمہ اربعہ کے علاوہ بعض علما، اس کے قائل ضرور ہیں کہ ایک طلاقِ رجعی ہوتی ہے اور یہ مذہب اہل حدیث نے بھی اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور طاؤس وعکرمہ وابن اسحٰق سے منقول ہے۔ پس کسی اہل حدیث کو اس حکم کی وجہ سے کافر کہنا درست نہیں اور نہ وہ قابل مقاطعہ اور نہ مستحق اخراج المسجد ہے۔ ہاں حنفی کا اہل حدیث سے فتویٰ حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا تو یہ بہ اعتبارِ فتوی ناجائز تھا۔ لیکن اگر وہ بھی مجبوری اور اضطرار کی حالت میں اس کا مرتکب ہوا ہو، تو قابل درگزر ہے۔"[2]

اس کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ 'مسئلہ طلاق ثلاثہ' در کتاب 'صراطِ مستقیم اور اختلافِ اُمت' از مولانا صغیر احمد شاغف بہاری اور راقم کی کتاب جس کا حوالہ اوپر گزرا: 'ایک مجلس کی تین طلاقیں اور اس کا حل'۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طلاق سے متعلق کچھ ضروری باتیں مزید بیان کر دی جائیں:

طلاق اور اس کا طریقہ

① مرد اور عورت کے درمیان نکاح کا رشتہ قائم ہو جانے کے بعد اکثر مذاہب میں علیحدگی اور طلاق کا کوئی

---

1 فتاوی مولانا عبدالحی لکھنوی: ص ۱٦٦

2 کفایت المفتی: ۶/ ۳۶۱

تصور نہیں ہے، حالانکہ بعض دفعہ جب دونوں کے مزاجوں میں موافقت اور ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکے تو طلاق اور علیحدگی ہی میں دونوں کی بھلائی ہوتی ہے۔ اس لیے اسلام نے مرد کو طلاق کا حق دیا ہے تاہم مرد کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنے اس حق طلاق کو آخری چارۂ کار کے طور پر ہی استعمال کرے۔ اس سے پہلے اصلاح کی جو چار تدابیر اللہ نے سورۃ النساء میں بیان فرمائی ہیں (جن کی تفصیل آگے آئے گی) ان کو بروئے کار لایا جائے۔ پھر بھی بات نہ بنے تو پھر طلاق کا فیصلہ کیا جائے۔

② یہ فیصلہ کر لینے کے بعد یوں ہی طلاق نہ دی جائے بلکہ اس کے لیے یہ طریق کار بتلایا گیا ہے کہ ایام حیض میں طلاق نہ دی جائے۔ نبی ﷺ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما پر برہمی کا اظہار فرمایا تھا جب انہوں نے ایام حیض میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ بلکہ اس وقت طلاق دی جائے جب بیوی کے ایام حیض ختم ہو جائیں اور وہ پاک ہو جائے۔ اس حالت کو طہر کہا جاتا ہے تو حکم یہ ہے کہ حالتِ طہر میں طلاق دی جائے اس سے صحبت کیے بغیر۔

اس حکم کا فائدہ یہ ہے کہ اکثر مرد حق طلاق کا بے جا استعمال کرتے ہوئے وقتی طور پر اشتعال اور غصے میں فوراً طلاق دے بیٹھتے ہیں، پھر پچھتاتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا؟ جبکہ ہم میاں بیوی کا نباہ صحیح طریقے سے ہو رہا ہے۔ اگر اشتعال اور غصے میں طلاق نہ دی جائے اور ایسے طہر کا انتظار کیا جائے جس میں خاوند نے بیوی سے ہم بستری نہ کی ہو، جیسا کہ حکم ہے تو اس انتظار کی وجہ سے اکثر و بیشتر غصے اور اشتعال کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور آدمی کو طلاق دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ اور یوں طلاق کی شرح بہت ہی گھٹ جاتی ہے۔ پھر طلاق صرف اسی صورت میں دی جائے گی جب مرد نے قطعی طور پر، اصلاح کی ساری تدابیر اختیار کرنے کے بعد، طلاق دینے ہی کا فیصلہ کر لیا ہو گا۔

③ جب طلاق دی جائے تو ایک ہی طلاق دی جائے، یعنی طلاق کا لفظ صرف ایک مرتبہ ہی استعمال کیا جائے: میں تجھے طلاق دیتا ہوں، یا تجھے طلاق ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اگر طلاق دینے کے بعد صلح کی صورت بن جائے تو نہایت آسانی سے صلح کا مرحلہ طے ہو جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ ایک طلاق کی صورت میں تمام مکاتب فکر کے نزدیک عدت (تین حیض یا تین مہینے) کے اندر بغیر نکاح کے رجوع اور صلح کر لینا جائز ہے اور رجوع کے لیے زبان ہی سے رجوع کا اظہار کر دینا کافی ہے۔ اس کے لیے کسی خاص عمل کا کرنا ضروری نہیں ہے اور اگر عدت گزر جائے تو ان کے درمیان دوبارہ نکاح کے ذریعے سے تعلق بحال ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ رجوع کرنے کے بعد دوبارہ بھی ایک طلاق دینے کی صورت میں عدت کے اندر رجوع کرنے کی اور

عدت گزر جانے پر نئے نکاح کے ذریعے سے تعلق بحال کرنے کا موقع رہتا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں اللہ نے ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ﴾ (البقرۃ۲:۲۲۹) میں دو مرتبہ طلاق دے کر مرد کو رجوع کرنے کا حق دیا ہے۔

پیچیدگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ایک ہی مرتبہ طلاق، طلاق، طلاق کا لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے، حالانکہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دینا ممنوع ہے اور نبی ﷺ نے اس پر سخت ناراضی کا اظہار فرمایا ہے۔ اس لیے اس میں بھی تمام مکاتبِ فکر متفق ہیں کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا ناجائز ہے۔ لیکن عوام جہالت کی وجہ سے غصے میں اسلام کی اس اہم ہدایت کی پروا نہیں کرتے اور ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دیتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علمائے احناف اس کو تین ہی قرار دے کر صلح اور رجوع کا راستہ بالکل بند کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں عوام بڑے پریشان ہوتے ہیں، اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ہماری نیت بیوی سے جدائی کی نہیں تھی، بس غصے میں طلاق دے بیٹھے، اور ہم یہ سمجھتے تھے کہ جب تک طلاق کا لفظ تین مرتبہ استعمال نہیں کریں گے تو طلاق ہی نہیں ہوگی، اشٹام پیپر میں بھی اس لیے تین طلاقیں لکھوائی جاتی ہیں۔

بنابریں طلاق دینے کا اگر فیصلہ کر ہی لیا جائے تو ایک ہی طلاق دی جائے۔ اس کے بڑے فائدے ہیں کیونکہ بعض دفعہ آدمی طلاق تو دے بیٹھتا ہے لیکن جب اس کے نقصانات اس کے سامنے آتے ہیں، مثلاً: میاں بیوی میں آپس میں بڑا پیار ہے، وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے، یا اولاد کا مسئلہ ہے، طلاق کے بعد ان کا مستقبل تاریک ہو جائے گا وغیرہ۔ اس قسم کی صورتوں میں اگر وہ دوبارہ ازدواجی تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں تو ایک طلاق کی صورت میں عدت کے اندر صلح اور رجوع کر کے اپنی غلطی کا ازالہ کر لیا جانا بڑا آسان ہے۔ اس کی راہ میں فقہی اختلاف بھی آڑے نہیں آتا۔ اس کے برعکس اکٹھی تین طلاقیں دینے کی صورت میں فقہی اختلاف کی وجہ سے معاملہ گھمبیر ہو جاتا ہے کیونکہ حنفی علماء اس صورت میں صلح کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ حلالہ کروا کے دوبارہ نکاح کی بحالی کا فتویٰ دیتے ہیں جو ایک لعنتی اور بے غیرتی کا کام ہے، جسے کوئی غیرت مند مرد گوارا نہیں کرتا، علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کروایا جائے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔[1]

بصورتِ دیگر یہ گھرانہ اُجڑ جاتا ہے، مرد الگ پریشان ہوتا ہے، بیوی کی زندگی بھی اجیرن ہو جاتی ہے اور بچوں کا مستقبل بھی تباہ۔ اور بعض دفعہ بچوں کو لینے دینے کے لیے عدالتی کارروائی میں دونوں میاں بیوی خوب

---

1 سنن ابی داؤد، حدیث:۲۰۷۸، ابن ماجہ، حدیث:۱۹۳۶

خوار ہوتے ہیں۔ تاہم کسی ایک کے حق میں فیصلہ ہو جانے کے بعد بھی بچے پریشان کن صورت حال سے دوچار رہتے ہیں، ان کو ماں کی جدائی برداشت کرنی پڑتی ہے یا باپ کی۔

فقہی جمود میں مبتلا علماء کے پاس اس معاشرتی مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے، البتہ شریعت اسلامیہ میں اس کا حل موجود ہے کہ ایک وقت کی تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق شمار کر کے رجوع کر لیا جائے جیسا کہ قرآن و حدیث کی تصریحات سے ثابت ہے۔ اس طرح ہزاروں، لاکھوں گھرانے برباد ہونے سے بچ جاتے ہیں۔[1]

④ چوتھی ہدایت یہ ہے کہ پہلی طلاق یا دوسری طلاق میں بیوی سے علیحدگی تو ضروری ہے لیکن عدت کے اندر اس کو گھر ہی میں رہنے دیا جائے، یعنی خاوند کے گھر میں۔ جہاں سے اسے نہ نکالا جائے۔ اس کا فائدہ اللہ نے یہ بتلایا ہے کہ مطلقہ کے اسی گھر میں رہنے سے، خاوند کے اندر رجوع کرنے کی رغبت اور جذبہ پیدا ہو جائے۔

﴿ لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝ ﴾ (الطلاق ۶۵:۱)

''تم نہیں جانتے شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دے۔''

اس لیے بعض مفسرین کی رائے ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صرف ایک طلاق دینے کی تلقین اور بیک وقت تین طلاقیں دینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اگر مرد ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دے (شریعت اسے جائز قرار دے کر نافذ بھی کر دے) تو پھر یہ کہنا بے فائدہ ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کوئی نئی بات (خاوند کے دل میں صلح کی رغبت) پیدا کر دے۔ (فتح القدیر از امام شوکانی)

عورت کو اپنا رویہ صحیح رکھنا چاہیے!

یہاں تک تو بات تھی مرد کے حق طلاق اور اس کے طریقۂ استعمال کی۔ اس مقام پر ہم چند باتیں خواتین سے بھی عرض کرنا مناسب بلکہ ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ مرد اکثر و بیشتر عورتوں کے رویوں کی وجہ سے طلاق دینے پر مجبور ہوتے ہیں، ورنہ کسی کو بھی اپنا گھر اُجاڑنا پسند نہیں۔ بنابریں عورتوں کو ہر وقت اپنا رویہ درست رکھنا چاہیے اور مرد کو اتنا پریشان نہیں کرنا چاہیے کہ معاملہ طلاق تک پہنچ جائے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ ان ہدایات پر عمل کیا جائے جو نیک عورت کے اوصاف ہیں۔ یہ ۱۹ یا ۲۰ کے

---

1 مزید تفصیل کے لئے: 'ایک مجلس کی تین طلاقیں اور اس کا شرعی حل': 'محدث' ستمبر ۲۰۱۷ء، شمارہ نمبر ۳۷۹

قریب صفات ہیں جو راقم کی کتاب 'حقوقِ مرداں اور حقوقِ نسواں' میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں عورت مرد کو اشتعال اور غصہ دلانے والی باتوں سے گریز کرے۔ اپنی زبان پر کنٹرول رکھے، بالخصوص جب خاوند غصے میں ہو۔ بالعموم فساد زبان کی بے احتیاطی سے پیدا ہوتا اور بڑھتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے زبان کی حفاظت پر بہت زور دیا ہے۔

اسی طرح جب خاوند عورت کے رویے سے تنگ آکر یہ کہتا ہے کہ میں تجھے طلاق دے دوں گا تو اکثر نادان عورتیں اپنی اصلاح کرنے کے بجائے، کہہ دیتی ہیں: اچھا طلاق دے دے اور خاوند اس کے جواب میں طلاق دے ڈالتا ہے، ظاہر بات ہے کہ یہ رویہ اپنے پیروں پر آپ ہی کلہاڑی مارنے والی بات ہے۔

بعض عورتیں اپنے خاوند کی ماں (اپنی ساس) یا اس کی بہنوں (نندوں) کی بابت خاوند کو یہاں تک کہہ دیتی ہیں کہ ماں کو (یا بہن) کو رکھ لے یا مجھے رکھ لے۔ ساس یا نندوں کے ساتھ گزارا کرنے کے بجائے ان سے اتنی شدید نفرت کا اظہار بھی اکثر و بیشتر طلاق پر منتج ہوتا ہے۔ ایسے رویے سے بھی بچا جائے۔

عورت کو یاد رکھنا چاہیے کہ آسمان کے نیچے زمین پر خاوند اس کے لیے سائبان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے اگر وہ محروم ہوگئی تو عورت کی حیثیت ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہے جس کو تند و تیز ہوائیں کسی ویرانے میں پھینک دیتی ہیں یا آوارہ لڑکوں کے ہاتھوں میں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ یا پھر عورت بھائیوں کی دستِ نگر بن کر ذلت و خواری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہے۔

طلاق کی قسمیں

① طلاقِ رجعی: وہ طلاق ہے جس میں عدت کے اندر خاوند کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔ اور یہ حق رجوع صرف پہلی اور دوسری طلاق میں ہے، تیسری طلاق کے بعد نہیں۔

② طلاق بائن: یہ وہ طلاق ہے کہ خاوند نے ایک طلاق دے کر چھوڑ دیا، رجوع نہیں کیا، حتی کہ عدت گزر گئی۔ لیکن یہ بینونہ صغریٰ ہے۔ اس میں عدت گزر جانے کے بعد خاوند کے ساتھ دوبارہ نکاح کے ذریعے سے تعلق بحال ہو سکتا ہے۔ (یہ پہلی اور دوسری طلاق کی حد تک ہے کیونکہ رجوع یا نکاح کے بعد بھی حق طلاق شمار میں آئے گا، یعنی ایک طلاق کے بعد رجوع یا نکاح ہوا ہے تو دو مرتبہ حق طلاق باقی رہے گا۔ دوسری طلاق کے بعد رجوع یا نکاح ہوا ہے تو ایک حق طلاق باقی رہ جائے گا۔)

③ طلاق بائنہ مغلظہ: اس سے مراد وہ طلاق ہے کہ خاوند دو مرتبہ طلاق دے کر عدت کے اندر رجوع کر چکا

ہے، پھر اس نے کچھ عرصے کے بعد طلاق دے دی، یہ تیسری طلاق، طلاقِ بائنہ مغلظہ ہے، اسے طلاقِ بتّہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس طلاق کے بعد خاوند رجوع کر سکتا ہے اور نہ اس سے نکاح۔

اب حلالہ شرعیہ کے بغیر زوجِ اوّل سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ اور حلالہ مروّجہ ملعونہ کے ذریعے سے کیا گیا نکاح باطل ہے۔ اس نکاحِ باطل سے عورت زوجِ اول کے لیے حلال نہیں ہو گی۔

④ **طلاق بالکنایہ:** اس میں طلاق کا لفظ خاوند استعمال نہیں کرتا بلکہ ذو معنیٰ لفظ استعمال کرتا ہے، جیسے تو میری طرف سے آزاد ہے یا فارغ ہے وغیرہ، اس قسم کے الفاظ سے اگر طلاق کی نیت ہو گی تو طلاق ہو گی بصورت دیگر طلاق نہیں ہو گی۔

احناف کی بیان کردہ طلاق کی تین قسمیں

یہاں ایک بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ فقہائے احناف نے طلاق کی تین قسمیں بیان کی ہیں اور وہ بہت مشہور ہیں۔ ایک طلاق احسن، دوسری طلاق حسن اور تیسری طلاق بدعی۔ طلاق احسن وہ ہے جو خاوند حالتِ طہر میں ہم بستری کیے بغیر ایک طلاق دے اور عدت میں رجوع نہ کرے، حتیٰ کہ عدت گزر جانے پر ان کے درمیان جدائی ہو جائے۔ طلاق حسن یہ ہے کہ ہر طہر میں ایک طلاق دے، اس طرح تین طہروں تین مہینوں میں تین طلاقیں پوری ہو کر طلاق مغلظہ، یا طلاق بتّہ واقع ہو جائے گی۔ تیسری قسم طلاق بدعی ہے اور اس سے مراد وہ طلاق ہے جو حالت حیض میں دی جائے۔ حیض میں طلاق دینا ممنوع ہے تاہم حیض میں دی گئی طلاق واقع ہو جائے گی۔

'طلاقِ حسن' طلاق کی بدترین قسم ہے!

'طلاق حسن' جو بہت مشہور ہے اور یہ طریقہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی بیان کیا ہے (سنن نسائی، ابن ماجہ وغیرہ) اس لیے اسے مسنون طریقہ سمجھ لیا گیا ہے اور اسے طلاقِ سنت کا نام دے دیا گیا ہے حالانکہ اسے طلاق سنت قرار دینا دینا کسی لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہے۔ اسی لیے مصنف ابن ابی شیبہ میں وہ طریقہ بھی منقول ہے جو سب سے بہتر بلکہ صحیح طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حالتِ طہر میں ایک طلاق دے کر چھوڑ دیا جائے۔ حتیٰ کہ تین حیض گزر جائیں۔[1]

---

1 مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث: ۱۸۰۳۶

ہدایہ میں ہے کہ "صحابہ اس بات کو مستحب سمجھتے تھے کہ طلاق کا عمل ایک طلاق سے زیادہ نہ کیا جائے حتی کہ عدت گزر جائے، یہ ان کے نزدیک، ہر طہر میں طلاق دینے کے مقابلے میں افضل ہے۔"

طلاق کی دوسری قسم 'طلاق حسن' ہے جسے طلاق سنت مشہور کر دیا گیا ہے، طلاق کی بدترین قسم ہے اس لیے کہ اس طرح طلاق کا عمل (پروسیس) تین حیضوں (یا تین مہینوں) میں مکمل ہوتا ہے اور اس طرح یہ طلاقِ مغلظہ یا طلاق بتہ بن جاتی ہے۔ اس کے بعد میاں بیوی میں دوبارہ تعلق کی بحالی کا راستہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا ہے۔ اس راستے کو کھولنے کے لیے حلالہ مروجہ ملعونہ کے جواز کا فتویٰ احناف کی طرف سے دیا جاتا ہے جو کسی غیرت مند مرد یا عورت کے لیے قابل برداشت نہیں ہے۔ یہ طریقہ حسن یا سنت کس طرح ہو سکتا ہے۔ اس لیے خود احناف کی سب سے معتبر کتاب ہدایہ میں امام مالک کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ طلاق کا یہ طریقہ بدعت ہے طلاق صرف ایک ہی مباح ہے۔ وقال مالك: إنه بدعة، ولا يباح إلا واحدة.[1]

بہر حال طلاق کا صحیح مسنون طریقہ یہی ہے کہ ایک طلاق دے کر چھوڑ دیا جائے۔ اگر صلح کی صورت نہیں بنتی اور عدت گزر جاتی ہے تو اس کے بعد عورت آزاد ہے اور وہ اپنے ولی کی اجازت سے جہاں چاہے شادی کر سکتی ہے۔ اس طریقۂ کار کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ عدت کے اندر (پہلی اور دوسری طلاق میں) رجوع ہو سکتا ہے۔ اگر عدت گزرنے کے بعد صلح کی صورت بنے تو بذریعہ نکاح دوبارہ تعلق بحال ہو سکتا ہے۔ اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔[2]

یہاں تک اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کی وضاحت ہے۔ ﴿ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ ﴾ (دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد) پھر روک رکھنا ہے موافق دستور کے۔ یعنی رجوع کر کے اچھے طریقے سے اسے بسانا۔ یہ حکم پہلی یا دوسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد کے لیے ہے، اس کے بعد اس سے نہ رجوع ہو سکتا ہے اور نہ ہی دوبارہ نکاح۔ اس لیے اسے احسان، یعنی ہدیے کے ساتھ رخصت کر دو۔

---

۱ الهداية: ۱/ ۲۲۶، المكتبة الاسلامية، بحوالہ المكتبة الشاملة

۲ اس کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: راقم کی کتاب 'حقوقِ مرداں اور حقوقِ نسواں'، ص ۲۸۶

آلِ سعود اور عثمانی سلاطین کا تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر[1]

ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ سعودی عرب کے حالیہ حکمران خاندان: آلِ سعود اور اس سے ماقبل سلطنتِ عثمانیہ کے حکمران خاندان: عثمانی ترکوں میں خیر کے پہلو بھی ہیں اور شر کے بھی لیکن دونوں خاندانوں میں خیر کا پہلو غالب ہے۔ لہٰذا اللہ عزوجل سے اُمید ہے کہ ان سے درگزر کا معاملہ فرمائے لیکن یہ بھی عین ممکن ہے کہ ان دونوں کو اُن کے شر کی وجہ سے پکڑ لے اور بالکل معاف نہ کرے، واللہ اعلم، کیونکہ نبی کریم ﷺ کے بہت سے فرامین میں حکام کی کوتاہیوں پر سخت ترین وعیدیں بھی آئی ہیں۔ البتہ ہم ان دونوں خاندانوں کے خیر کی وجہ سے اُن سے محبت رکھتے ہیں اور ان میں موجود شر سے اعلانِ براءت کرتے ہیں اور ان دونوں حکومتوں کو ایسی مسلمان حکومتیں بھی سمجھتے ہیں کہ جنہوں نے دین کی بہت زیادہ خدمت کی ہے۔

کچھ عرصے سے ہمارے بعض دوستوں نے سوشل میڈیا، خاص طور فیس بک اور وٹس ایپ گروپس میں آلِ سعود اور عثمانی سلاطین کا تقابل شروع کر رکھا ہے کہ جس میں آلِ سعود کو عثمانی سلاطین کے مقابلے میں ڈاکو لٹیرے، غاصب، باغی اور خارجی تک ثابت کیے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور جو کچھ زیادہ مہربان دوست ہیں تو وہ تو عرب بادشاہوں کو برطانوی استعمار کی پیداوار، برطانوی گماشتے، اُمتِ مسلمہ کے نمک حرام، سور اور خنزیر جیسی گالیاں دینے سے بھی باز نہیں آتے جبکہ دوسری طرف عثمانی سلاطین کو خلفائے اُمت قرار دے کر ان کی نیکی کے یوں گن گاتے ہیں جیسے وہ کوئی مقدس گائے ہوں۔ ہماری نظر میں اس تقابلی جائزے کے پیچھے محض مسلکی تعصب کارفرما ہے کیونکہ آلِ سعود، سلفی فکر رکھتے ہیں جبکہ عثمانی سلاطین، حنفی المذہب تھے لہٰذا عثمانی سلاطین کو فرشتے اور آلِ سعود کو شیطان ثابت کیا جاتا ہے۔

ہم جب آلِ سعود اور عثمانی سلاطین کے دستور، نظام حکومت اور کردار کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سعودی عرب کے دستور میں جتنا اسلام موجود ہے اور عملاً بھی جس قدر اسلام سعودی عرب میں نافذ ہے، عثمانی سلطنت کے، نہ تو دستور میں اتنا اسلام موجود تھا اور نہ ہی وہاں عملاً اتنا اسلام نافذ تھا، لہٰذا دستور و نظام

---

[1] اسسٹنٹ پروفیسر کامساٹس یونیورسٹی، لاہور ... فاضل جامعہ لاہور الاسلامیہ ۲۰۰۴ء

کی سطح پر سعودی حکومت، عثمانی سلطنت سے زیادہ اسلامی رہی ہے اور ابھی تک ہے بھی۔ یہ تو ان کے طرزِ حکمرانی کی بات ہے، جہاں تک دوسری بات رہی شخصی کردار کی تو اللہ جانے، اللہ کے ہاں کسی کا کیا مقام ہے لیکن آلِ سعود کے شروع کے حکمران عثمانی سلاطین سے کئی اعتبار سے کردار میں بھی بظاہر بلند نظر آتے ہیں۔

سعودی و عثمانی دستور اور نظام کا تقابلی مطالعہ

اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ہمارا ایک تجزیہ ہے اور اس سے آپ کو دلیل کی بنیاد پر اختلاف ہو سکتا ہے۔ بس کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ جو تاریخی حقائق میں بیان کر رہا ہوں اور جن مصادر سے بیان کر رہا ہوں، آپ یہ واضح کر دیں کہ ہمارے مصادر ناقابل اعتبار ہیں اور آپ اس کے برعکس جو دوسرا موقف رکھتے ہیں تو اس کے مصادر ہمارے بیان کردہ مصادر سے زیادہ مستند ہیں اور ان ان وجوہات سے ہیں، بس اتنی سی بات ہے۔ باقی اللہ عزوجل نے ہم انسانوں کو اختلاف کے لیے پیدا کیا ہے اور ہم یہ کرتے رہیں گے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ۝ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ﴾ (ھود ١١:١١٨)

”اور وہ ہمیشہ اختلاف کرتے ہی رہیں گے، سوائے ان کے جن پر آپ کا ربّ رحم کرے، اور (اسی طرح) تو ان کے ربّ نے ان کو پیدا کیا ہے۔“

دوسرا تاریخی حقائق کے بیان میں بعض کے نزدیک کچھ مصادر مستند ہیں اور کچھ ہمارے نزدیک، اس میں ضروری نہیں کہ ہمارا اتفاق ہو سکے۔ اب یہ رویہ درست نہیں ہے کہ میں جن مصادر سے حقائق بیان کر رہا ہوں ان میں سے ہر مصدر آپ کے نزدیک سطحی ہے اور بغیر کسی وجہ کے اور جن مصادر سے آپ بیان کر رہے ہیں، ان میں سے ہر مصدر بخاری و مسلم کی طرح مستند ہے اور بلا کسی وجہ کے۔ اب خلافتِ عثمانیہ اور آلِ سعود تو قریبی زمانے کی باتیں ہیں جس میں کتبِ حدیث جیسے مستند اقتباس پیش کرنا ناممکن ہے۔ سو حالیہ مصادر کے بیان میں دو چیزیں اہم ہوتی ہیں، ایک مؤرخ کی فکر و کردار یعنی وہ صالح ہونا چاہیے، اور دوسرا اہلیت اور محنت یعنی وہ مؤرخ اس موضوع کو بیان کرنے کی اہلیت رکھتا ہو اور اس نے تحقیق کرتے وقت اس پر خوب محنت کی ہو۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ اس تاریخی مصدر کو ردّ کریں، ہاں اس کے بیان سے آپ کو اتفاق نہیں ہے تو آپ اس کا جواب ضرور دیں، یہ آپ کا حق بنتا ہے۔

تیسرا اگر میں سعودی دستور و نظام کو عثمانی دستور و نظام پر ترجیح دیتا ہوں تو مجھے بھی کہا جا سکتا ہے کہ آپ مسلکی تعصب میں ایسا کر رہے ہیں تو دیکھیں یہ بات درست ہے کہ ذاتی اعتبار سے آلِ سعود کی عثمانی سلاطین پر ترجیح کی ایک وجہ تو ہمارے نزدیک آل سعود کی سلفی سوچ اور عقیدہ ہے۔ عثمانی سلاطین صوفی سوچ اور عقیدے

کے حامل تھے، اگرچہ ان کا مذہب حنفی تھا۔ تو یہ عین ممکن ہے کہ احناف کو عثمانیوں کے حنفی المذہب ہونے کی وجہ یا صوفی ہونے کی وجہ اُن سے زیادہ قربت محسوس ہو اور وہ اس کے لیے اپنے آپ کو حق بجانب محسوس کرتے ہوں گے تو یہی صورت حال ایک سلفی فکر رکھنے والے عالم دین کی بھی ہوتی ہے کہ جس سوچ کو وہ حق سمجھتا ہے اور جس عقیدے کو اس نے حق سمجھ کر اختیار کیا ہے تو اب اسے طبعاً ان حکمرانوں کی طرف زیادہ میلان اور قرب محسوس ہو گا جو اس سوچ اور عقیدے کے حامل ہوں گے۔ دوسری بات یہ بھی ذہن میں رہے کہ آلِ سعود خود سلفی سوچ اور فکر کے نمائندے نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی مذہبی فکر میں آل الشیخ (محمد بن عبد الوہاب) کے قریب ہونے کی وجہ سے سلفیہ کے نزدیک ممدوح قرار پاتے ہیں۔ اور سلفی سوچ اور فکر کے اصل نمائندے آل الشیخ ہیں۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عصبیت سب میں ہوتی ہے، کوئی اس سے خالی نہیں ہے کہ آپ فکری اعتبار سے پہلے ہی سے کوئی نہ کوئی پوزیشن لیے ہوتے ہیں، کسی لاادری (Agnostic) کی طرح خلا میں نہیں ہوتے۔ قرآن مجید نے جس عصبیت سے منع کیا ہے، وہ جاہلیت کی عصبیت ہے یعنی جس میں جذبات انسان کی سوچ اور فکر پر غالب آجائیں[1]۔

مزید برآں جب عصر حاضر کی دو جہادی تحریکوں، تحریک طالبان افغانستان اور القاعدہ کا ہم نے اپنی کتاب 'عصر حاضر میں تکفیر، خروج، جہاد اور نفاذِ شریعت کا منہج' میں تقابلی مطالعہ پیش کیا تو وہاں بعض وجوہات کی بنا پر واضح طور تحریک طالبان، افغانستان کو القاعدہ پر ترجیح دی ہے۔ ایک محقق کا کام مسلکی تعصب اور فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر حقائق کی جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ لیکن ہوتا یہی ہے کہ جب نتیجہ مخالف فرقے کے حق میں جاتا ہو تو مخالفین محقق کو 'حق گو' کہنا شروع کر دیتا ہے لیکن جب اس کے خلاف جاتا ہو تو وہی محقق مسلک پرست بن جاتا ہے۔ ہماری نظر میں مسلک پرست محقق وہ ہوتا ہے کہ جس کی ہر تحقیق صرف اپنے مسلک ہی کے صحیح ہونے کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔ جس محقق کی تحقیقات اس کے معروف مسلکی بیانیات کے خلاف بھی چلی جاتی ہوں تو اس کی بات سے کلی اتفاق نہ سہی لیکن وہ قابل غور ضرور ہوتی ہیں، اس اعتبار سے کہ وہ کل حقیقت نہ بھی ہو تو بھی حقیقت کا ایک اہم رخ ضرور بیان کر رہی ہوتی ہیں۔

اوّل: ملوکیت اور خلافت

سعودی عرب کے نظام پر جو اہم تنقید کی جاتی ہے کہ یہ ملوکیت ہے۔ لیکن مجھے یہ بتلائیں کہ ملوکیت کی کون

---

[1] ﴿ إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ ﴾ (الفتح ۴۸:۲۶)

سی تعریف ایسی ہے کہ جس پر دولتِ عثمانیہ پوری نہ اترتی ہو؟ کیا وہاں باپ کے بعد بیٹا جانشین نہیں بنتا تھا؟ کیا وہاں چھ صدیوں تک ایک ہی خاندان کی حکومت نہیں رہی؟ کیا اس خاندان نے بزورِ شمشیر اپنی حکومت قائم نہیں کر رکھی تھی؟... تو اور ملوکیت کس کو کہتے ہیں؟ ۱۸۷۶ء کے عثمانی اساسی دستور کی دفعہ ۳ میں واضح طور موجود ہے کہ اقتدار آلِ عثمان سے باہر نہیں جائے گا اور اس کے بڑے بیٹے کو منتقل ہو گا جیسا کہ ماضی میں یہی اُصول کار فرما رہا ہے[1] بلکہ دفعہ ۵ میں تو یہ بھی موجود ہے:

"أن ذات حضرة السلطان هو مقدس وغير مسؤول."[2]

''حضرت سلطان مقدس ہیں اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔''

یعنی اس سے کوئی سوال نہیں کر سکتا کہ وہ کسی فرد یا ادارے کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔ دوسری طرف آلِ سعود نے کم از کم اپنے دستور میں یہ طے کیا ہے کہ اقتدار صالح بیٹے (اَصلح) کو منتقل ہو گا جیسا کہ ۱۹۹۲ء کے دستور کی دفعہ ۵ کی شق ب میں یہی بات موجود ہے۔ بڑا ہونا کوئی معقول وجہ نہیں ہے لیکن افسوس کہ آلِ سعود کے ہاں بھی اس شق پر عمل نہیں کیا گیا، البتہ نظریے کے اعتبار سے ان کا موقف درست ہے۔ اگرچہ عثمانی سلطنت کا اساسی دستور تھوڑے عرصے کے لیے نافذ العمل رہا ہے لیکن توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ یہ دستور عثمانی سلطنت کے عرف ورواج کو بھی متعین کر رہا ہے کہ وہ کیا رہا ہے۔ تو عثمانی سلطنت میں حکمران آلِ عثمان میں سے ہی ہو گا، یہ بات ایسے ہی چلی آ رہی تھی، کوئی دستور نے پہلی مرتبہ نافذ نہیں کی بلکہ دستور نے صرف یہ واضح کیا کہ ماضی کے اُصول اور رواج کے مطابق آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

باقی یہ سوال کہ آپ عثمانی سلطنت کو خلافت سمجھتے ہیں یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہی ہے کہ یہ بھی ملوکیت والی خلافت تھی جیسا کہ سعودی عرب میں ہے۔ اور میرے نزدیک ملوکیت والی خلافت، خلافت ہی کا ایک کم تر درجہ ہے کہ جس میں کم از کم مسلمانوں کی سیاسی اور ملی وحدت برقرار رہتی ہے۔ 'ملوکیت والی خلافت' سے مراد

---

۱ القانون الأساسي، مطبعة الآداب، بیروت، ۱۹۰۸ء، ص ۴

۲ ایضاً

۳ آرٹیکل ۵(ب): يكون الحكم في أبناء الملك المؤسس عبد العزيز بن عبد الرحمن الفيصل آل سعود وأبناء الأبناء، ويُبايع الأصلح منهم للحكم على كتاب الله تعالىٰ وسنة رسوله ﷺ.

''حکومت، بانی سلطنت عبد العزیز بن عبد الرحمٰن الفیصل آل سعود کے بیٹوں اور پوتوں میں ہو گی۔ ان میں سے جو کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے نفاذ کے لئے اصلح (موزوں ترین) فرد ہو گا، اس کی بیعت کی جائے گی۔''

(سعودی عرب کا دستور جدید از ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد، ماہنامہ محدث، جنوری ۱۹۹۳ء، ۲۳/۱، شمارہ ۱۹۳، ص ۲۱۲)

یہ ہے کہ حکومت وسلطنت تو ایک ہی خاندان میں رہے جیسا کہ ملوکیت میں ہوتا ہے لیکن اسلام بطور نظریہ اور نظام کے غالب رہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جیسے فقہ، کلام اور تصوف ہمارے ہاں کی روایتیں ہیں اور ہمیں ان کی اصلاح کی پوزیشن لے کر ان پر ناقدانہ جائزہ لینا ہے، کھرے اور کھوٹے کی تمیز کرنی ہے، بعینہٖ اسی طرح خلافت کے نظام کی روایت پر بھی نقد کی ضرورت ہے لیکن مخالفت کی نہیں بلکہ اصلاح کی پوزیشن لے کر۔ اس نقد وتبصرے سے اسلامی تحریکوں کو ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہوئے صحیح رخ میں آگے بڑھنے میں مدد ملے گی۔ ہماری نظر میں عثمانی سلاطین اس طرح کی مقدس شخصیت نہیں ہیں کہ ان پر بات نہ ہو سکے جیسا کہ آلِ سعود بھی اس طرح کے مقدس نہیں ہیں، نہ تنقید سے بالاتر ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ دونوں پر نقد وتبصرہ میں عدل کے دامن کو تھامنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

تو ملوکیت کی رٹ لگا کر آلِ سعود سے بغض کا اظہار کرنے والوں کو یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ بھی ملوکیت ہی کی ایک صورت تھی لیکن وہاں چونکہ مسلکی تعصب آڑے آجاتا ہے لہٰذا یہ چیز نظر انداز ہو جاتی ہے۔ تو ملوکیت اگر فی نفسہ بری ہے تو صرف آلِ سعود کی نہیں، سلطنتِ عثمانیہ کی بھی بری ہے، دونوں میں فرق کیوں کیا جاتا ہے۔ باقی ہماری نظر میں ملوکیت فی نفسہ بری نہیں ہے بلکہ بادشاہ اچھے برے ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام بھی ایک بادشاہ تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی بادشاہت وراثت میں حضرت داؤد علیہ السلام سے حاصل کی۔ تو بادشاہ اچھا ہے اور اسلام کے نظامِ عدل کو نافذ کرنے والا ہے تو ملوکیت رحمت ہے اور خلافت ہی کا ایک درجہ ہے اور اگر بادشاہ ظالم اور برا ہے اور اسلام کا نفاذ کرنے والا نہیں ہے تو ملوکیت بری ہے اور خلافت کے ادنیٰ درجے میں بھی شامل نہیں ہے۔ تو سعودی دستور میں کہیں بھی بادشاہ کو مقدس شخصیت نہیں کہا گیا ہے جیسا کہ سلطنتِ عثمانیہ کے دستور میں ہے البتہ عملاً صورت حال یہی ہے کہ سعودی عرب میں بادشاہ پر تنقید کرنے کو پسند نہیں کیا جاتا بلکہ بعض اوقات بعض علماے کرام کو ایسا کرنے پر قید بھی کر دیا جاتا ہے۔ تو اس پر آپ نقد کریں، ضرور کریں۔ تاہم حکام اور عوام سب پر شریعتِ اسلامیہ ہی غالب ہے، اور رعایا کو بھی تنقید کرتے ہوئے شرعی ضوابط کو ترک نہیں کرنا چاہیے، جن میں سے اہم تر شرعی ضابطہ یہ ہے کہ تنقید کسی اجتہادی موقف کی بجائے، مسلمہ شرعی مسئلہ میں کوتاہی پر ہو سکتی ہے، نیز شریعت ہمیں حاکم کی خیر خواہی اور ان کے ذاتی ظلم وجور پر خاموشی کا پابند کرتی ہے، سو یہ تنقید اصلاح وخیر خواہی سے بڑھ کر تمسخر واستہزا تک نہیں پہنچنی چاہیے۔

غرض آلِ سعود کی خارجہ پالیسی اور سیاسی فیصلوں شرعی حدود میں تنقید ہو سکتی ہے بلکہ ہونی بھی چاہیے لیکن ان سے اختلاف کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ مسلکی اختلاف کی بنا پر اُمتِ مسلمہ کے ہر نقصان کی ذمہ داری

ان پر ڈال دی جائے اور یہ کہ ان کے خیر کے پہلو کو تسلیم نہ کیا جائے اور نہ ہی اس کو بیان کیا جائے۔ اب تو بعض مخالفین کی یہ صورت حال بن چکی ہے کہ ان کی گلی کے گٹر کا ڈھکن نہیں ہے تو اُن کے خیال میں اس کے ذمہ دار بھی آل سعود ہیں لہٰذا اس پر اُن کو گالیاں دینی بنتی ہیں۔

دوم: اسلامی شریعت کا نفاذ

مخالفین کا دوسرا بڑا اعتراض یہ ہے کہ سعودی عرب کا نظام مکمل طور اسلامی نہیں ہے کہ وہاں سودی کاروبار کو حکومتِ وقت نے جواز بخش رکھا ہے جو خود اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مانا کہ سعودی عرب کا نظام مکمل طور اسلامی نہیں ہے اگرچہ اس کا آئین اسلامی ہے، اس میں شک نہیں۔ لیکن سعودی عرب کے نظام میں دو بڑی خیریں موجود ہیں؛ ایک یہ کہ ان کا آئین کتاب و سنت کو فائنل اتھارٹی قرار دیتا ہے اور اسی کو یعنی کتاب و سنت ہی کو مملکت کا آئین قرار دیا گیا ہے اور کتاب و سنت کی کسی متعین تعبیر کو بھی قانون کے طور نافذ کرنے سے گریز کیا گیا ہے جیسا کہ دستور کی پہلی دفعہ میں ہے:

"مملکت سعودیہ مکمل طور پر خود مختار عرب اسلامی ملک ہے، اس کا دین 'اسلام'، دستور کتاب اللہ اور سنت رسولؐ، زبان عربی اور دارالحکومت 'الریاض' ہے۔"[1]

اور دفعہ ۴۸ میں ہے:

"تمام عدالتیں پیش ہونے والے جملہ مقدمات میں شریعت اسلامیہ کے احکامات کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہوں گی جیسا کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ سے ثابت ہیں۔ نیز انتظامی عدالتیں حکام کی طرف سے نافذ کردہ اُن نظاموں کے مطابق فیصلہ کریں گی جو کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے مخالف نہ ہوں۔"[2]

اسی طرح دفعہ ۴۶ میں ہے:

'عدلیہ' ایک آزاد اور بااختیار ادارہ ہوگا جس پر شریعتِ اسلامیہ کی بالادستی و برتری کے علاوہ اور کوئی بالادستی نہیں ہوگی۔"[3]

اور سعودی عرب کے نظام میں دوسرا خیر یہ ہے کہ کتاب و سنت کی تعبیر اور نفاذ عدل کا کام سکہ بند علما پر

---

۱ سعودی عرب کا دستور جدید از ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد: ص ۲۱۱

۲ ایضاً: ص ۲۱۶-۲۱۷

۳ ایضاً: ص ۲۱۶

چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہاں کی عدالتوں میں قاضی اور ججز حضرات خالص علماء وفقہاء ہوتے ہیں، جو شرعی علوم کے ماہر ہونے کی بنا پر خالص کتاب وسنت کے مطابق فیصلے کرتے ہیں۔ لہٰذا سعودی عرب میں شریعت میں مذکور جرائم کے حوالے سے، جس میں تمام اہم ترین جرائم آجاتے ہیں، کوئی متعین وضعی قانون نافذ نہیں بلکہ کتاب وسنت ہی براہِ راست نافذ ہیں یعنی ان کی نصوص۔ اور ان نصوص کی تعبیر کلیتاً علماء پر چھوڑ دی گئی ہے۔

البتہ سعودی عرب نے 'نظام' کے نام سے کچھ قوانین کو نافذ کیا ہے اور 'نظام' دراصل وہ مسائل ہیں جن میں براہِ راست شرعی احکام موجود نہیں، اور ان میں شوریٰ مصلحت کے مطابق کوئی بھی قانون بنا سکتی ہے جیسا کہ ٹریفک یا دوسری اقوام سے تجارتی لین دین کے قوانین وغیرہ۔ ان کے نزدیک جہاں دوسری اقوام سے لین دین کا معاملہ آتا ہے تو اس پر اسلامی دستور لاگو نہیں ہوگا جیسا کہ دستور کی دفعہ ۸۱ میں ہے:

"اس دستور کو ان معاہدات اور بین الاقوامی سمجھوتوں پر نافذ العمل نہیں کیا جائے گا جو مملکت نے دوسری حکومتوں اور بین الاقوامی تنظیموں سے طے کئے ہوئے ہیں۔"[1]

اگرچہ اس معاملے میں سعودی عرب سے اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ 'نظام' کی بعض چیزیں بھی شریعت کے دائرے میں براہ راست آسکتی ہیں لیکن کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہاں انسانی زندگی کے ایک بڑے دائرے میں کتاب وسنت نافذ ہے بلکہ نظام سے متعلق اگرچہ عدالتیں علیحدہ سے بنی ہوئی ہیں لیکن نظام کے تحت کوئی مسئلہ اگر کسی شرعی عدالت میں چلا جائے تو اس کا فیصلہ شریعت کی روشنی میں ہی ہوتا ہے اور وہ نافذ العمل بھی ہوتا ہے۔ تو سعودی عرب میں دو عدالتی نظام چل رہے ہیں؛ ایک شرعی عدالتی نظام اور دوسرا نظام کے عنوان سے وضعی قوانین پر مبنی عدالتی نظام۔ اور سعودی عرب نے یہ عدالتی ڈھانچہ سلطنتِ عثمانیہ سے لیا کہ سلطنت عثمانیہ میں ۱۹۴۰ء میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا کہ جسے مؤرخین کے ہاں تنظیمات کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں فرانسیسی، اطالوی اور انگریزی قوانین کو سلطنت میں نافذ کیا گیا اور اس کے لیے علیحدہ سے عدالتیں بھی قائم کی گئیں۔[2] مثال کے طور پر سلطنت عثمانیہ نے فرنچ ضابطہ فوجداری کو اپنے ہاں ۱۸۴۰ء میں نافذ کیا تھا اور اس میں سے زنا اور چوری کی حد وغیرہ کو ساقط کر دیا لیکن سعودی عرب نے حدود کو باقاعدہ نافذ کیا بلکہ اس طرح سے نافذ کیا ہوا ہے کہ وہ اس حوالے سے دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سعودی عرب میں جرم کی

---

۱ ایضاً: ص ۲۲۰

۲ الدولة العثمانية: عوامل النهوض وأسباب السقوط للدكتور علي محمد محمد الصلابي، دار التوزيع والنشر الإسلامية، ۲۰۰۱ء، ص ۳۸۰-۳۸۱

شرح (Crime rate) بہت کم[1] ہے۔

واضح رہے کہ اُنیسویں صدی کے ربع ثانی میں سلطنتِ عثمانیہ میں یورپی ممالک کے قوانین کا نفاذ شروع ہو چکا تھا اور اُنیسویں صدی کے اختتام تک صورت حال یہ تھی کہ سلطنت عثمانیہ میں سوائے ایک دیوانی قانون (Civil Law) یعنی مجلّة الأحكام العدلية کے ہر قانون یورپی اقوام سے ماخوذ و مستعار تھا اور مجلّة الأحكام العدلية کا نفاذ بھی اس عرفی حیثیت کے ساتھ تھا کہ عدالتوں میں قاضی حضرات اس کے مطابق فیصلہ کرنے کے پابند نہیں تھے تو گویا سلطنت کا واحد اسلامی قانون بھی لازمی کی بجائے اختیاری ہی تھا۔[2]

البتہ اُنیسویں صدی عیسوی (یعنی ۱۸۰۱ء تا ۱۹۰۰ء) سے پہلے سلطنتِ عثمانیہ کے قانونی مصادر میں شریعتِ اسلامیہ کی فقہی تعبیر فقہ حنفی کے علاوہ، قانون [عثمانی سلاطین کے تحریری فرامین]، قومی و ملکی رسم و رواج اور مقتدر سلطان کے فرامین شامل ہوتے تھے۔[3] اگرچہ کہا یہی جاتا تھا کہ عثمانی سلاطین کے فرامین، شریعت سے بالاتر نہیں تھے لیکن عملاً ایسا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عثمانی سلاطین نے جو چیزیں اپنے فرمان کے ذریعے بطورِ قانون نافذ کروانا ہوتی تھیں تو وہ علماء و فقہاء سے زبردستی اس کے حق میں فتوے لے لیتے تھے جیسا کہ سلطان محمد الفاتح نے سب سے پہلے 'بھائی کے قتل کا قانون' نافذ کیا تھا اور اس کے فرمان میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ اس نے علماء و فقہاء کی اجازت سے یہ قانون جاری کیا ہے۔ اس قانون کے الفاظ یہ تھے:

---

۱ روزنامہ جنگ کے کالم نگار خلیل احمد نینی تال والا لکھتے ہیں: "آج سے ۴۰ سال قبل شاہ فیصل مرحوم سے دورۂ امریکہ میں ایک مشہور یونیورسٹی میں ایک پروفیسر نے سوال کیا سعودی عرب میں سزائے موت کیوں ہے؟ جبکہ امریکہ جیسے مہذب ملک میں قتل کے بدلے قید کی سزا ہوتی ہے۔ اس کے جواب میں مرحوم شاہ فیصل نے ۲ دلائل دیئے۔ پہلا: آپ کا قانون مظلوم کو انصاف دینے کے بجائے ظالم کو بچانے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ اور صرف ایک کمزور دلیل پر رہا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے صرف نیویارک میں ہر سال ۱۰ ہزار سے زیادہ بچیوں اور خواتین کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے اور ملزم چند سال گزار کر رہا ہو جاتا ہے۔ اُنہوں نے بتایا کہ صرف نیویارک میں ۸ ہزار سے زیادہ اس سال قتل ہو چکے ہیں۔ جواب میں ۵ ہزار کے قریب افراد پکڑے گئے جن کو ۱۴ سال کی سزا ہوئی جو کٹ کر آدھی رہ جائے گی۔ بتایا جائے مقتول کو کہاں انصاف ملا؟ جبکہ نیویارک سے ۵ گنا بڑے ملک سعودی عرب میں پورے سال میں ۱۰ قتل ہوئے۔ ہم نے ان قاتلوں کو چند ہفتوں میں مجرم ثابت کر کے ان کے سر قلم کر دیے۔ ایک طرف مقتول خاندان کو انصاف مل گیا تو دوسری طرف کروڑوں افراد کو سبق مل گیا کہ قاتل بچ نہیں سکتا اور قتل کرنے سے پہلے ۱۰۰ دفعہ سوچے گا۔ بتائیں صرف ۱۰ افراد کی قربانی دے کر ہم نے کروڑوں افراد کو تحفظ فراہم کر کے مثال قائم کر دی ہے۔ آپ کا مہذب معاشرہ پانچ ہزار افراد کو سزائیں دے کر بھی تحفظ فراہم نہ کر سکا تو ظالم آپ ہوئے یا ہم۔" (روزنامہ 'جنگ' لاہور: ۲۸ فروری ۲۰۱۸ء)

۲ مجلّہ، اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع اول، ۱۹۸۵ء، ۱۸/ ۵۸۲

۳ دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر محمد عزیر، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۹ء، ۲/ ۳۱۳

"إذا تيسرت السلطنة لأي ولد من أولادي فيكون مناسبًا قتل أخوته في سبيل تأسيس نظام العالم وقد أجاز هذا معظم العلماء فيجب العمل به."[1]

"جب میری اولاد میں سے کسی کو اقتدار حاصل ہو جائے تو اس کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ سلطنت کے نظام کی بنیاد رکھنے کے لیے اپنے بھائیوں کو قتل کر دے اور اکثر علماء نے اس کی اجازت دی ہے، لہٰذا اس پر عمل ضروری ہے۔"

اس قانون کے مطابق عثمانی خلیفہ کے لیے یہ فرض تھا کہ وہ اپنے تمام بھائیوں کو قتل کروا دے یہاں تک کہ سلطان محمد الفاتح نے تو اپنے شیر خوار یعنی دودھ پیتے بھائی کو قتل کروا دیا تھا۔ اگرچہ اس بارے یہ بحث بھی موجود ہے کہ بعض مؤرخین کے نزدیک سلطان الفاتح نے اپنے شیر خوار بھائی کو قتل نہیں کروایا تھا بلکہ کسی اور نے اس کی آشیر باد حاصل کرنے کے لیے اس کا قتل کیا تھا۔[2] البتہ شیر خوار بھائی کو قتل کرنے کے واقعے کا تذکرہ مسلمان مؤرخین کے ہاں بھی ملتا ہے جیسا کہ ترک نژاد مصنف محمد فرید بک[3] اور دار المصنفین، الہند کے رفیق مصنف ڈاکٹر محمد عزیر نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔[4]

سوم: خروج اور بغاوت

پھر اچھے بھلے پڑھے لکھے حنفیہ کا دعویٰ ہے کہ آل سعود باغی اور خوارج ہیں کہ اُنہوں نے عثمانیوں کے خلاف بغاوت اور خروج کیا تھا۔ اصل میں ان بیچاروں کا اور کوئی مسئلہ نہیں، بس انہیں سلفیوں کے خاف چارج کیا گیا ہے اور یہ چارج انہیں ان کے علماء نے کیا ہے۔ چارج کا مطلب یہ ہے کہ حنفی عوام کو ان کے علماء نے اہل حدیث اور سلفیوں کے خلاف بھرا ہے اور اتنا بھرا ہے کہ ابھی تک حنفی دلی طور پر برصغیر کے اہل حدیث اور سعودی عرب کے سلفیوں کو ایک مکتبِ فکر کے طور قبول کرنے کو تیار ہی نہیں ہیں کہ اب ان کا بھی ایک جماعت کے طور کوئی وجود ہے۔ تاریخ نجدیہ[5]، تاریخ وہابیت، تاریخ نجد وحجاز جیسی کتابیں اور پھر قاضی ابن

---

1. الدولة العثمانية المجهولة للدكتور أحمد آق كوندر وسعيد أوزتورك مكتبة آمرو توران، استنبول، ص۱۲۹
2. ایضًا: ۱۴۰-۱۴۱
3. تاريخ الدولة العلية العثمانية از محمد فرید بک، دار النفائس، بیروت، ۱۹۸۱ء، ص۱۶۱
4. ڈاکٹر عزیر احمد کی کتاب کا نام دولت عثمانیہ ہے اور سید سلیمان ندوی کے شاگرد ڈاکٹر عزیر احمد ہیں اور سید صاحب کے بقول یہ کتاب سات سال کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے اور اردو زبان میں دولت عثمانیہ کی تاریخ پر پہلی جامع اور مستند ترین کتاب ہے۔ اس کتاب کو دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، الہند نے شائع کیا ہے۔
5. اس کتاب کے ٹائٹل پیج پر یہ عبارت ثبت ہے: "اس کتاب میں نجد، شیخ نجدی اور اُس کے بنا کردہ فرقۂ وہابیہ کے حالات، عقائد اور

عابدین شامی سے لے کر مولانا حسین احمد مدنی تک کے فتاوی نے یہی کام کیا ہے کہ سعودی سلفی عثمانی سلاطین کے باغی، تکفیری اور خارجی ہیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے، مولانا علی میاں ابو الحسن علی ندوی اور مولانا منظور احمد نعمانی رحمہم اللہ کا کہ ان جیسے اہل علم نے شیخ محمد بن عبد الوہاب کے بارے چند کلماتِ خیر کہہ 'دیے، ورنہ برصغیر کے حنفی، سعودی سلفیت کو سفلیت سے کم درجہ تیار دینے کو جو تیار نہیں ہیں تو ان کے پیچھے حنفی علماء کے فتاوی کا ہاتھ ہے۔ اگر مولانا رشید احمد گنگوہی نے بھی شیخ محمد بن عبد الوہاب کے بارے کلمہ خیر ہی کہا تھا لیکن ان کے شاگردوں میں جو رائے عام ہوئی، وہ اس کے برعکس تھی۔[۲]

اس اعتراض کا حقیقی جواب یہ ہے کہ یہ لوگ اگر تاریخ کا غیر جانبدار مطالعہ کریں تو ان سے اعتراض ہی نہ بن پڑے۔ ویسے تو سعودی سلطنت تین مرتبہ قائم ہوئی ہے لیکن دو مرتبہ کا قیام قابل ذکر ہے اور عموماً کتب تاریخ میں دو مرتبہ کا ہی ذکر ہے تو دونوں مرتبہ کے قیام میں سعودی سلطنت کا مرکز نجد کا علاقہ تھا۔ اور نجد ۵۰۰ ہجری کے بعد کسی بڑی سلطنت کی عمل داری میں نہیں رہا اور نہ ہی یہاں عثمانیوں نے کبھی قبضہ کیا بلکہ یہاں کا نظام حکومت یہ تھا کہ مختلف شہروں پر مختلف قبائل کے اُمرا کا قبضہ ہوتا تھا اور کوئی مرکزی حکومت قائم [۳]نہ تھی۔ پہلی سعودی سلطنت ۱۷۴۴ء میں درعیہ یعنی نجد میں آل سعود اور آل الشیخ میں باہمی معاہدے کے نتیجے میں قائم ہوئی اور مقامی قبائل کو دعوت اور ان سے قتال کے نتیجے میں قائم ہوئی۔ اور اس قتال کی وجوہات بھی یہی بیان کی جاتی ہیں کہ شیخ محمد بن عبد الوہاب کی دعوت کی توسیع اور اثر ورسوخ سے مقامی قبائل نے ان کے معتقدین کو ستانا اور اذیت پہنچانا شروع کر دیا تھا کہ جس کے نتیجے میں جھڑپیں ہوئیں اور نجد کا پورا علاقہ آلِ سعود کے قبضے میں آگیا۔ اور جہاں تک حجاز پر قبضے کی بات ہے تو حجاز اگرچہ عثمانیوں کی عمل داری میں تھا لیکن آل سعود نے اس پر حملہ میں پہل نہیں کی۔ البتہ آلِ سعود کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ سے ڈر کر

کارنامے بیان کیے گئے ہیں کہ اس نے کس بے دردی سے مسلمانوں کو قتل کیا۔ اُن کے اموال لوٹے اور اُن کے مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی کی۔ جس پر ترک غازیانِ اسلام شمشیر بکف نکلے اور نجدیوں کو بد اعمالیوں کی خوب سزا دی۔ ابن سعود کی سابقہ مسلم کشی اور طائف میں ہونے میں مظالم کا بھی اس میں ذکر ہے۔ انجمن حزب الاحناف لاہور نے اپنے اسلامی بھائیوں کو حقیقتِ حال سے باخبر کرنے کیلیے ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ میں شائع کیا۔"

۱ مولانا منظور احمد نعمانی کی کتاب کا نام 'شیخ محمد بن عبد الوہاب کے بارے پروپیگنڈا اور ہندوستان کے علماے حق پر اس کے اثرات'

۲ مولانا کی یہ رائے فتاوی رشیدیہ میں موجود ہے۔

۳ دعاوي المناوئین لدعوة الشيخ محمد بن عبد الوهاب از عبد العزیز بن محمد بن علی آل عبد اللطیف، دار الوطن، الریاض، ۱۴۱۲ھ، ص ۲۳۵-۲۳۸

عثمانیوں کے والی شریفِ مکہ[1] نے ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) میں نجد پر حملوں کی ابتدا کی۔[2] دوسری طرف حجاز میں ہی عثمانیوں کے خلاف مقامی قبائل نے بغاوت کر دی اور وہ کمزور پڑ گئے۔ اور آل سعود نے مکہ مکرمہ ۱۸۰۶ء میں قتال نہیں بلکہ صلح کے نتیجے میں حاصل کیا کیونکہ ان کا اثر ورسوخ حجاز کے قبائل میں بھی بڑھ چکا تھا۔[3]

البتہ احساء کے علاقے کے بارے کہا جاتا ہے کہ وہ براہ راست عثمانیوں کی عمل داری میں رہا تھا لیکن آل سعود نے یہ علاقہ بھی بنو خالد سے حاصل کیا تھا جو عثمانیوں کے باغی تھے۔ عثمانیوں کی اس علاقے میں عمل داری ۱۵۵۲ء سے ۱۶۶۹ء تک رہی تھی جبکہ آل سعود نے اسے بنو خالد سے بزور شمشیر ۱۷۹۴ء میں حاصل کیا تھا اور اس کی وجہ بھی بنو خالد کے نجد پر حملوں کے جواب دیتے ہوئے اس علاقے کو فتح کرنا تھا۔[4] البتہ ۱۸۱۸ء کی جنگ میں آلِ سعود کی شکست کے بعد یہ علاقہ دوبارہ عثمانیوں کے مصری گورنر محمد علی پاشا کے واپس پاس چلا گیا تھا لیکن محمد علی پاشا کہ جس نے عثمانیوں کی ایما پر آل سعود کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا، خود عثمانیوں کا باغی ہو گیا اور ۱۸۳۲ء کی جنگ میں عثمانیوں کو شکست دے کر مصر پر قبضہ کر لیا اور اپنے تئیں اسے عثمانیوں سے آزاد کروالیا۔[5]

آلِ سعود کے اثر ورسوخ کے بڑھنے کی اصل وجہ عثمانیوں کا محلاتی سازشوں میں اُلجھ جانا تھا۔ جب آل سعود نجد وحجاز میں اپنی حکومت قائم کر رہے تھے، اس وقت سلطان مصطفی الرابع اپنے باپ سلطان سلیم الثالث کو قتل کر کے خود پایۂ تخت کو سنبھال رہا تھا۔ اور پھر سلطان مصطفی الرابع نے بھی کوئی ایک سال ہی حکومت کی ہو گی کہ اس کے بھائی سلطان محمود الثانی نے اسے قتل کر کے سلطنت کی باگ دوڑ سنبھال لی۔[6]

تو آلِ سعود پر خروج کا الزام لگا کر انہیں عثمانی سلطنت کی کمزوری کا سبب بنانے کی بجائے خود عثمانیوں کی باہمی ریشہ دوانیوں اور جنگوں پر غور کریں۔ جتنے خروج عثمانیوں نے عثمانیوں کے خلاف کیے، اتنے شاید ہی اور سب نے مل کر ان کے خلاف کیے ہوں۔ یہاں تو ہر اگلی حکومت ہی خروج پر قائم ہوتی تھی۔ سلطان بایزید اول

---

۱ شریف مکہ کا منصب فاطمیین مصر کے دور میں ۹۶۷ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس منصب کی بنیادی ذمہ داری مکہ اور مدینہ میں عازمین حج وعمرہ کا انتظام وانصرام ہوتا تھا۔ (ح۔م)

۲ 'محمد بن عبد الوہاب: ایک بدنام اور مظلوم مصلح' از مسعود عالم ندوی، فیصل اکیڈمی، لائل پور، ۱۹۷۵ء، ص ۷۱

۳ ایضاً: ص ۷۶-۷۷

۴ تاریخ المملکة العربیة السعودیة از عبد اللہ الصالح عثیمین، مکتبة العبیکان، الریاض ۲۰۰۵ء، ص ۱/ ۱۲۵-۱۳۰

۵ دولت عثمانیہ: ۲/ ۶۱-۶۴

۶ ایضاً: ۱/ ۴۲۳

یلدرم کے چار بیٹے: محمد، سلیمان، عیسیٰ اور محمد آپس میں لڑتے رہے یہاں تک کہ محمد سلطان بن گیا۔ اسی طرح بایزید ثانی کے تین لڑکے کرکود، احمد اور سلیم آپس میں لڑتے رہے یہاں تک کہ سلیم غالب آگیا اور اپنے باپ بایزید کو تخت سے اُتار کر حکمران بن گیا۔[1]

پھر آلِ سعود کو یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ وہ عثمانیوں کے خلاف کفریہ طاقتوں کے آلہ کار بنتے رہے۔ یہ کام آلِ سعود نے تو کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن عثمانی شہزادوں نے ضرور کیا ہے۔ یہ شہزادے آپس کی باہمی جنگوں میں غالب آنے کے لیے یورپ کے عیسائی حکمرانوں کے آلہ کار بنتے رہے۔ اس حوالے سے ایک ترک شہزادے جم کی کہانی کافی معروف ہے۔ تو پہلے تو ان بغاوتوں اور خروجوں کی شرعی حیثیت کا تعین کریں جو عثمانیوں نے عثمانیوں کے خلاف برپا کیے ہیں، پھر آلِ سعود کی بات کیجیے گا۔

دوسری مرتبہ سعودی سلطنت ۱۹۰۲ء میں قائم ہوئی اور اس مرتبہ بھی نجد پر عثمانیوں کی عمل داری نہیں تھی اور آلِ سعود نے ریاض شہر آلِ رشید سے حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد آلِ سعود کی تیسری حکومت پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے عثمانی خلافت کو کمزور کیا۔ تو حجاز بھی ۱۹۲۵ء میں آلِ سعود نے شریف مکہ سے حاصل کیا ہے جو کہ عثمانیوں کا باغی تھا اور اس نے بغاوت کر کے ۱۹۱۶ء میں حجاز میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔[2] آلِ سعود کے مذکورہ تینوں مراحل کے حقائق سے ثابت ہوا کہ تینوں مرتبہ انہوں نے خلافت عثمانیہ سے ٹکراؤ کے بجائے ان کے بعد آنے والے حکام سے ان علاقوں پر حکومت حاصل کی۔

چہارم: مسلمانوں سے قتال

ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ آلِ سعود نے مسلمانوں سے جنگیں کر کے نجد اور حجاز کا اقتدار حاصل کیا ہے۔ تو اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ عثمانی سلاطین نے شام و مصر، فلسطین و حجاز کے علاقے کیا اصحابِ رسولؐ سے وراثت میں حاصل کیے تھے؟ سامنے کی بات ہے کہ عثمانیوں کے جد امجد نے ایشیائے کوچک میں ایک چھوٹی سی شہری سلطنت کی بنیاد رکھی تھی تو اس کے بعد جو سلطنت میں اتنی توسیع ہوئی ہے، تو وہ کیا انگریزوں سے ہی لڑ کر ہوئی ہے؟ نہیں ایسا بالکل نہیں بلکہ عثمانیوں سے حجاز اور بلاد حرمین کے علاقے مصر کے ماتحت ہوا کرتے تھے اور مصر پر عثمانیوں سے پہلے 'ممالیک' سلاطین کا قبضہ تھا جسے سلطنت مملوک (Mamluk Sultanate) کہتے

---

۱ ایضاً: ۱/ ۷۳-۷۴

۲ ایضاً: ۱/ ۱۴۱-۱۴۲

۳ مختصر تاریخ الدولة السعودية از ڈاکٹر فیصل بن مشعل، ص ۸۴-۸۶

ہیں جو تقریباً اڑھائی سو سال (1250ء تا 1517ء) تک قائم رہی یہاں تک کہ عثمانیوں نے آکر اسے ختم کیا۔

پہلے ۱۵۱۶ء میں حلب کے مقام پر جنگ میں ہزاروں مسلمان شہید ہوئے اور اس کے نتیجے میں شام عثمانی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۵۱۷ء میں مصر فتح ہوا، قاہرہ میں خوب قتل عام ہوا جس کے نتیجے میں عثمانیوں کے ہاتھوں پچاس ہزار مسلمان مارے گئے کیونکہ مصر کے ممالیک نے خوب مزاحمت کی تھی۔[1] تو عثمانیوں نے بھی مسلمانوں کے قتل عام کے نتیجے میں تمام مسلمان علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کیا تھا، تو اگر آلِ سعود کے ہاں یہ باہمی قتل وغارت ناجائز ہے تو عثمانیوں کے ہاں کیسے جائز ہے؟ یا تو دونوں جگہ ناجائز کہیں، یا دونوں جگہ جائز کہیں۔ اور عثمانیوں نے اپنی سلطنت کی توسیع کے لیے مسلمانوں کی جس قدر قتل وغارت کی ہے، امر واقعہ یہ ہے کہ آل سعود نے اس کا عشر عشیر بھی نہیں کیا کیونکہ اتنی وسیع سلطنت کا قیام اتنے بڑے پیمانے پر قتل وغارت گری کے بغیر ممکن نہ تھا۔ دوسرا یہ کہ عثمانیوں نے محض اپنی سلطنت کی توسیع کے لیے اسلامی ممالک کی مسلم آبادیوں کو روندا جبکہ آل سعود کے پاس کم از کم یہ توجیہ موجود ہے کہ انہوں نے حملوں میں پہل نہیں کی تھی بلکہ دوسروں نے کی تھی اور ان کا حملہ جوابی کاروائی تھی۔

عثمانی حکمران سلطان بایزید یلدرم (م ۱۴۰۳ء) نے امیر تیمور کے مخالفین کو پناہ دی تو امیر تیمور نے انہیں سلطان سے واپس مانگا تو اس پر سلطان نے امیر تیمور کو ٹکا سا جواب دے دیا اور دونوں طرف کی خط وکتابت میں ایک دوسرے پر تند و تیز جملے کسے گئے۔[2] اس خط وکتابت میں امیر تیمور نے آل عثمان کی خدمات کا اعتراف بھی کیا لیکن ساتھ میں انداز بھی توہین کا رکھا[3] جس کے نتیجے میں ۱۴۰۲ ہجری میں انقرہ/انگورہ کی جنگ ہوئی اور عثمانیوں کو ایسی شکست فاش ہوئی کہ ایک مرتبہ عثمانی سلطنت ختم ہو گئی جیسا کہ آلِ سعود کی حکومت بھی ختم ہو گئی تھی۔ اور بقول بعضے: امیر تیمور سلطان بایزید کو قید کر کے پنجرے میں لیے اپنے ساتھ مہینوں پھرتا رہا جو کہ بالکل بھی مناسب طرزِ عمل نہیں تھا لیکن اسی تذلیل کی وجہ سے سلطان بایزید کی وفات ہو گئی۔[4] امیر تیمور نے قیدی سلطان بایزید کو یہی کہا کہ کفار یعنی یورپ کے ساتھ تمہارے جہاد کی قدر میرے دل میں ہے اور جب تک

---

۱ دولتِ عثمانیہ: ۱/۱۴۶، ۱۵۳

۲ النجوم الزاهرة في ملوك مصر والقاهرة از يوسف بن تغري الحنفي، دار الكتب، مصر، ۱۲/۲۶۷

۳ الدولة العثمانية: عوامل النهوض وأسباب السقوط: ص۶۱

۴ امیر تیمور کو بعض مورخین نے تعزیہ نکالنے کی وجہ سے شیعہ لکھا ہے لیکن زیادہ تر مؤرخین کی نظر میں وہ سنی تھا اور شافعی المسلک تھا۔ بہر حال اس کا سنی ہونا ہی زیادہ قرین قیاس ہے جیسا کہ ڈاکٹر محمد الصلابی نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے، البتہ یہ بات درست ہے کہ امتِ مسلمہ کے حق میں وہ دوسرا اجاج تھا کہ جس نے کافروں سے زیادہ مسلمانوں کو فتح کرنے میں اپنی زندگی گزار دی۔

تم وہ کرتے رہتے، میں تمہیں ہر طرح سے اسپورٹ کرتا، مال سے بھی اور لشکر سے بھی، لیکن تم مجھ سے اُلجھنے لگ گئے اور نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔[1]

پھر یہ کہ شام و مصر کی فتح میں سلطان سلیم نے یہ سب قتل وغارت گری صرف اس لیے کی تھی کہ اس کے نام کا خطبہ پڑھا جائے اور اسے خادم الحرمین الشریفین کا لقب حاصل ہو لیکن دوسری طرف آلِ سعود کے ہاں اس قتل وغارت کی معقول مذہبی وجہ موجود تھی، اور وہ شریعت کا نفاذ تھا۔ اب بھلے آپ اس مذہبی وجہ سے اتفاق نہ کریں اور انہیں خارجی قرار دیں لیکن عثمانیوں کے پاس تو سوائے ذاتی اقتدار کے اور کوئی وجہ موجود نہیں تھی۔ پھر یہ کہ عثمانیوں کے جد امجد ارطغرل (م ۱۲۸۸ء) نے جب اس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی تو مذہب دور دور تک اس کے پیش نظر نہیں تھا، وہ صرف اپنے قبیلے کا اقتدار چاہتا تھا بلکہ بعض مؤرخین کا کہنا یہ بھی ہے کہ وہ مسلمان نہیں تھا لیکن یہ ایک ضمنی بحث ہے۔

پنجم: انگریزی استعمار کی پیداوار اور آلہ کار

پھر اعتراض یہ ہے کہ آلِ سعود برطانوی استعمار سے معاہدے کے نتیجے میں وجود میں آئے، لہٰذا یہ اس کے گماشتے ہیں۔ یہ بات بھی حقیقت سے عاری، نرا الزام ہے کہ وہ برطانیہ سے معاہدے کے نتیجے میں وجود میں آئے البتہ اُنہوں نے ریاست قائم کر لینے کے بعد برطانیہ سے معاہدہ ضرور کیا، اس لیے کہ وہ اس وقت کی سپر پاور تھا، اور اس لیے کہ وہ اسے تسلیم کرے، کیونکہ اس دور میں اقوام متحدہ جیسا کوئی ادارہ تو موجود نہیں تھا، اور دنیا میں ۱۹۶۵ء سے قبل ڈالر کی بجائے پاؤنڈ کا سکہ چلتا تھا۔ برطانیہ سے آلِ سعود کا معاہدہ ۱۹۱۵ء میں ہوا ہے، جبکہ آلِ سعود کی منظم پیش قدمی ۱۹۰۲ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۱۴ تک پورے جزیرہ عرب تک پھیل گئی۔

میں نے سارا معاہدہ پڑھا ہے، مجھے کوئی ایسی چیز معلوم نہیں ہو سکی جو ان حالات میں کسی قوم کے لیے شرعی

---

۱ دولت عثمانیہ: ۱/ ۷۰-۷۱

۲ ۱۹۰۲ء میں حالیہ شاہ سلمان کے والد عبدالعزیز بن سعود نے ریاض سے اپنے حریف آلِ رشید کو بے دخل کرتے ہوئے اپنی طاقت کو مزید مستحکم کیا۔ اس کی بعد اور ۱۹۱۳ء میں خلیجی ساحل کا کنٹرول حاصل کر لیا۔ اس کی بعد آلِ سعود کی حکومت مختلف علاقوں میں آگے بڑھتی رہی، تا آنکہ ۱۹۱۳ء میں اُنہوں نے خلیجی ساحل کا کنٹرول حاصل کر لیا۔ حجاز میں ۱۹۱۸ء میں سلطنت عثمانیہ کو برطانوی حمایت یافتہ شریف مکہ حسین بن علی نے شکست دی۔ حسین بن علی کے شریف مکہ بننے کے بعد ۱۹۲۴ء میں عبدالعزیز بن سعود نے اپنے حملے تیز کر دیے اور آخر کار ۱۹۲۵ء میں شریف مکہ حسین بن علی سے اقتدار لے لیا۔ ۱۹۳۲ء میں آج کے سعودی عرب کی بنیاد رکھتے ہوئے عبدالعزیز بن سعود نے خود کو بادشاہ قرار دیا۔

طور ناجائز ہو سکے کہ اس معاہدے کی اصل یہ تھی کہ برطانیہ اُنہیں تسلیم کرے گا اور وہ اپنی حدود سے آگے بڑھ کر ان مسلمان علاقوں پر حملہ نہیں کریں گے کہ جن پر برطانیہ کا قبضہ ہے۔

معاہدہ تو سید المرسلین ﷺ جو مدینہ کے حاکم تھے اور شرعی سزائیں نافذ کرتے تھے، نے بھی مدینہ کے یہود سے کیا تھا یعنی میثاقِ مدینہ اور مشرکین مکہ سے بھی کیا جیسا کہ صلح حدیبیہ۔ تو کیا کفار سے صرف معاہدہ کرنے سے مسلمان کفار کے گماشتے بن جاتے ہیں؟ پھر اسلامی جمہوریہ پاکستان بھی برطانیہ سے ایک معاہدے کے نتیجے میں ہی وجود میں آیا، کیا ہم محض اس بنیاد پر اسے برطانوی استعمار کی پیداوار کہہ دیں کہ اس کا خالق برطانیہ ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ لوگوں کو آلِ سعود کے خلاف ان کے سلفی ہونے کی وجہ سے، حنفی مولویوں کی طرف سے چارج زیادہ کیا گیا ہے۔

آلِ سعود اور خلافت عثمانیہ کی یہ ساری بحث کشمیر کے مسئلے پر چلی ہوئی ہے کہ جب سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے حکمرانوں نے مودی سے ہاتھ ملائے، معاہدے کیے، اسے میڈل پہنائے تو ہمارے پاکستانیوں نے سوشل میڈیا پر عربوں کو نمک حرام اور برطانوی گماشتے اور معلوم نہیں کیا کیا کہنے کی یلغار کر دی۔ تو آپ عربوں پر ضرور تنقید کریں لیکن پہلے آئینہ بھی دیکھ لیں۔ مجھے اس میں زیادہ مسئلہ نہیں ہے کہ آپ عربوں کو نمک حرام کہیں یا امریکی غلام، مجھے زیادہ مسئلہ اس میں ہے کہ آپ نمک حراموں اور امریکی غلاموں سے تیل اُدھار لے کر اپنا ملک چلا رہے ہیں، کہاں گئی آپ کی غیرت؟

دوسرا آپ کو اعتراض یہ ہے کہ انڈیا کشمیر میں ظلم کر رہا ہے اور عرب دنیا انڈیا کے ساتھ معاشی معاہدے کرتی پھر رہی ہے۔ تو آپ کی حکومت نے بھی یہی کام کیا ہے کہ جب چین سنکیانگ میں مسلمانوں پر ظلم کر رہا تھا تو آپ سی۔ پیک کی خوشیاں منا رہے تھے۔ اور سنکیانگ کے مسلمانوں کے لیے میڈیا میں کوئی آواز نظر آ رہی تھی تو وہ ہیومن رائٹس والوں کی تھی، اگرچہ وہ یہ سب کچھ اپنے ایجنڈے کے لیے کر رہے تھے لیکن اس وقت تمہاری یہ ساری غیرت کدھر تھی؟ یہ ٹوئٹر کی مہم جوئی، یہ فیس بک اور واٹس ایپ پوسٹیں۔ یہ نمک حرامی اور بے غیرتی کے تمغے۔ اسی طرح جب برما میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا ہوتی ہے، پاکستانی میڈیا یہ ظلم نہیں دکھاتا، انٹرنیشنل میڈیا دکھاتا ہے، پھر امریکی حکومت اور یورپین ممالک اپنے مفاد کی خاطر ہی سہی، برما کے مسلمانوں کے حق میں بولتے ہیں اور پاکستان ان حالات میں برما کی حکومت کو جنگی طیارے بیچنے کے معاہدے کر رہا ہوتا ہے تو پاکستانی کیسے امت مسلمہ کے وفادار ہو گئے؟ اسی طرح امریکہ افغانستان پر حملہ کرتا ہے تو ہم اسے لاجسٹک اسپورٹ فراہم کرتے ہیں، رستے دیتے ہیں۔ اور 'سب سے پہلے پاکستان' کے نام پر اپنے ملی، نظریاتی

تعلق اور علاقائی مفادات کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔

تو مسلمان دنیا میں کیا صرف کشمیر میں بستے ہیں۔ اگر عربوں نے کشمیر کے مسلمانوں سے وفانہ کی تو ہم نے بھی تو وہی حرکت برما، چین اور اَفغانستان کے مسلمانوں کے ساتھ کی ہے کہ جس کی شکایت ہم کشمیر کے حوالے سے عربوں سے کر رہے ہیں۔ تو جب سبھی مسلمان حکمران ایک جیسے ہیں تو ایک کو برا بھلا کہنے کا فائدہ یا ایک ہی کو ٹارگٹ کیے جانے کا مقصد؟ ہاں، ایک مقصد پورا ہوتا ہے، مسلکی عصبیت اتارنے کا کوئی موقع ہاتھ سے ضائع نہ ہو جائے۔

حالیہ بحث کشمیر کے مسئلے پر چلی ہے، پاکستان ایٹمی طاقت ہے، اسے بھارت سے کشمیر لینے کے لیے کیا عربوں کی حمایت کی ضرورت ہے؟ عربوں کو پاکستان کی حمایت کے لیے دوڑنا چاہیے تھا، نہ کہ پاکستان کو۔ یہ تو ہماری ناکامی ہے تو اس کی گالیاں عربوں کو کیوں دیں؟ میں یہ نہیں کہتا کہ آلِ سعود ٹھیک کر رہے ہیں، ان کا یہ رویہ درست نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ حکمران سب ایسے ہی ہوتے ہیں، اس حمام میں سب ننگے ہیں، صرف عربوں کو گالیاں دینے کا فائدہ نہیں۔ اب ایک گندگی کا ڈھیر، دوسرے گندگی کے ڈھیر کو یہ کہنا اچھا لگے گا کہ تم تو گندگی کے ڈھیر ہو۔

آلِ سعود کی عثمانی سلاطین پر ترجیح کی وجہ

اگر آپ یہ کہیں کہ آلِ سعود کو عثمانیوں پر ترجیح دینے کی معقول وجہ آپ کے پاس کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی معقول ترین وجہ یہ ہے کہ آلِ سعود کی حکومت توحید اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نعرے پر وجود میں آئی اور یہ آلِ سعود اور آل الشیخ کے باہمی معاہدے کا نتیجہ تھی جو تقریباً 1157ھ یعنی ۱۷۴۴ء میں ہوا کہ جس کے مطابق امیر درعیہ محمد بن سعود نے شیخ محمد بن عبد الوہاب کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کی تھی کہ شیخ محمد بن عبد الوہاب اسے اسپورٹ کریں گے تو وہ بدلے میں توحید کا نظام قائم کرے گا، شرک اور بدعات کا خاتمہ کرے گا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا اہتمام کرے گا۔[1]

شیخ محمد بن عبد الوہاب کی دعوت کے نتیجے میں پہلے امیر عیینہ نے محمد بن سعود کی بیعت کی اور پھر اہل حریملا نے بھی کی اور اس طرح شروع میں دعوت کے نتیجے میں آلِ سعود کی سلطنت وسیع ہوئی۔ اس کے بعد مقامی

---

[1] 'محمد بن عبد الوہاب: ایک بدنام اور مظلوم مصلح' از مسعود عالم ندوی: ص ۴۱

عرب قبائل سے ان کی جھڑپیں بھی ہوئی ہیں لیکن ان کے بقول اس کی وجہ یہ تھی کہ شیخ محمد بن عبد الوہاب کے متبعین کو اہل شرک وبدعت ستاتے اور اذیت پہنچاتے تھے کہ جس کے نتیجے میں یہ جھڑپیں ہوئیں اور نجد کے قلب پر ۱۱۸۷ھ تک آلِ سعود کا قبضہ ہو گیا۔ تاریخی کتب میں ایسے واقعات بکثرت ملتے ہیں کہ چونکہ شیخ محمد بن عبد الوہاب کی تحریک کا آغاز نجد سے ہوا تھا جبکہ حجاز ابھی ان کے پاس نہیں تھا تو نجد کے حجاج کو حج کرنے سے باقاعدہ روکا جاتا تھا اور جو کسی طرح پہنچ جاتے تھے تو انہیں قید کر لیا جاتا اور اسی قید میں بعض کی وفات بھی ہوئی۔[1] اس کے بعد حجاز کی حکومت بھی بزورِ شمشیر آلِ سعود کے پاس آگئی۔

یہ بھی واضح رہے کہ آلِ سعود کی حکومت ایک مذہبی معاہدے کا نتیجہ تھا جبکہ عثمانیوں کی حکومت، آلِ سلجوق کی حمایت کا نذرانہ تھی اور اس کے بدلے عثمانیوں نے آلِ سلجوق سے رہتے دم تک وفا کی، اس میں شک نہیں۔ پھر آلِ سعود پر یہ الزام ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو قتل کروا دیتے ہیں تو یہی کام عثمانیوں نے کیا ہے بلکہ آلِ سعود سے بہت بڑھ چڑھ کر کیا ہے۔ تو دونوں نے غلط کیا ہے۔ ہم کسی کی حمایت نہیں کر رہے لیکن ہم صرف اتنا کہہ رہے ہیں کہ عثمانی جب اپنے بھائیوں کو قتل کر دیتے تھے، ان میں سے بعض بغاوت کے نتیجے میں قتل ہوتے تھے اور بعض نے ابھی بغاوت نہیں کی ہوتی تھی، پھر بھی قتل کر دیے جاتے تھے اور اس کی دلیلیں قرآن سے ڈھونڈی جاتی تھیں کہ فتنہ، قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ تو آلِ سعود تو اس حد تک نہیں گرے کہ اپنے بھائیوں کو محض بغاوت کے اندیشے سے ہی قتل کروا دیں اور اس کا کوئی اسٹیٹ آڈر بھی جاری کروا دیں۔

خلاصۂ کلام

اس ساری بحث میں اصل سوال ہے کہ تاریخ میں جب یہ بات ثابت ہے کہ اس قسم کی مسلمانوں کی باہمی قتل وغارت گری کے بغیر کوئی بڑی اسلامی سلطنت قائم نہیں ہو سکی اور جو قائم ہوئیں، وہ آج ہمارے لیے آئیڈیل ہیں تو پھر آج القاعدہ، داعش اور طالبان افغانستان کو اس باہمی قتل وغارت گری پر تنقید کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے؟ کیا یہ امکان نہیں ہے کہ اگر انہیں غلبہ حاصل ہو جائے تو سو سال بعد وہ بھی مسلمانوں کے خلیفہ اور ہیرو قرار پا جائیں، ہماری خود کش حملہ آوروں کے خلاف کی جانے والی تمام فیس بکی پوسٹوں کے باوجود۔ ہم ماضی اور حال میں کیوں ایسا فرق روا رکھتے ہیں کہ ماضی پر ہونٹ سی لیں اور حال کے واقعات پر تنقید کریں۔ کیا

---

۱ ایضاً: ص ۶۱-۶۲

ماضی، صرف روایت ہونے کی وجہ سے مقدس گائے بن گیا ہے؟ تو خلافت کی روایت کو بھی ناقدانہ نظر سے دیکھیں۔ بلاشبہ یورپ کے خلاف جہاد میں عثمانیوں کی بہت خدمات ہیں، ان کی سلطنت ایک مذہبی سلطنت تھی کہ جس میں خیر غالب تھی لیکن یہ سلطنت جس طرح سے قائم ہو رہی تھی یعنی مسلمانوں کے باہمی قتال کے نتیجے میں تو کیا وہ طریقہ جائز تھا؟ تو یہ تو بعد کی بات ہے کہ عثمانی سلاطین کی یہ خدمت کیا کم ہے کہ انہوں نے عالم اسلام کو یکجا اور جمع کیا تھا۔

پہلے تو یہ واضح کریں کہ عالم اسلام کو جمع کیسے کیا؟ یہ اصل سوال ہے کیا جس طرح انہوں نے جمع کیا، اس طرح ہم بھی تمام عالم اسلام یا اس کے ایک حصے کو جمع کرنے کا حق رکھتے ہیں؟ اگر ہاں، تو القاعدہ، داعش اور طالبان افغانستان کیوں غلط ہیں؟

ہمیں تاریخ سے سبق سیکھنا ہے، اچھا یا برا، اس لیے اس سوال کا جواب لازم ہے تاکہ عصر حاضر کی اسلامی تحریکوں کے لیے کوئی لائحہ عمل طے ہو سکے۔ ہماری رائے میں مسلمانوں کے ہر قسم کے باہمی قتال کی نفی کرنی ہے اور اسے شر ہی کہنا ہے لیکن اگر اس کے نتیجے میں کسی گروہ کو اقتدار اور غلبہ حاصل ہو جائے تو اب اسے تسلیم کر لینا چاہیے، چاہے وہ سلفی ہو یا حنفی۔ ہم نے طالبان افغانستان کے بارے یہی کہا تھا کہ افغانستان میں ان کا غلبہ شر یعنی مسلمانوں کی باہمی قتل وغارت کے رستے ہوا لیکن جب ہو گیا تو اب تسلیم کر لینا چاہیے، اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے۔ تو بہت مرتبہ اللہ عزوجل شر سے خیر برآمد کر دیتے ہیں لیکن ہم شر کو شر ہی کہیں گے، بھلے اس سے برآمد ہونے والا خیر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ اور ہم شر سے خیر پیدا کرنے والے رستوں کے خلاف بھی بات کریں گے کہ ان کا استعمال کسی طور جائز نہیں ہے۔ باقی آلِ سعود کوئی مقدس گائے نہیں ہیں، ان کے حالیہ حکمرانوں کو ضرور تنقید کا نشانہ بنائیں لیکن مسلکی تعصب نکالنے کے لیے نہیں، امت کی خیر خواہی کے جذبے سے۔ اور وہ تبھی نظر آئے گی جبکہ ان کے شر پر نقد کے ساتھ ان خیر کی تعریف بھی کریں گے۔ اگر حنفیوں کو آلِ سعود میں کوئی خیر نظر نہیں آتا تو پھر سلفیوں کو بھی عثمانیوں میں کوئی خیر نظر نہیں آئے گا۔ آپ اکثریت میں ہیں، اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ ہر وقت لینے والا ہاتھ آگے کیے رکھیں۔ ☆☆

نوٹ: اس موضوع کی مزید تفصیل اور شواہد کے لئے مدیر محدث کا تفصیلی مضمون اگلے شمارہ میں ملاحظہ کریں۔

امام مالک اور موطا: ایک تعارف

حافظ خضر حیات
ایم فل، کلیۃ الحدیث، مدینہ یونیورسٹی

عالم اسلام کے مایہ ناز امام ہمام، امام مالک اور ان کی عظیم الشان تالیف لطیف الموطأ کی مسلمانوں کے ہاں بہت قدر و منزلت ہے۔ شروع سے لیکر اب تک اس پر بہت کچھ لکھا گیا، اور ہنوز یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ زیر نظر مضمون میں موطا اور اس کے مصنف کے تعارف کا مختصراً بیان ہے۔ اصل تحریر عربی میں تھی جو چار برس قبل ۲۰۱۵ء میں مدینہ یونیورسٹی کے کلیۃ الحدیث کے کورس مصادر السنّۃ میں بطور 'مقالہ' جمع کروائی گئی تھی۔ اب کچھ حک واضافہ کے ساتھ اسے اُردو زبان میں پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) امام مالک بن انس کا تعارف

اسم گرامی و نسب نامہ اور کنیت ولقب: ابو عبد اللہ مالک بن انس بن مالک بن أبي عامر بن عمرو بن الحارث بن غيمان بن خثيل بن عمرو الحميري الأصبحي المدني التيمي القرشي.[1]

ولادتِ باسعادت: امام صاحب کے سنہ ولادت کے متعلق تین اقوال ہیں: ۹۳ھ، ۹۴ھ اور ۹۲ھ، لیکن خود امام صاحب نے اپنی تاریخ ولادت ۹۳ھ بیان کی ہے، لہٰذا امام ذہبی نے اسی بات کو ترجیح دی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی والدہ تین سال تک حالت حمل میں رہی تھیں۔[2]

پرورش و نشو نما: امام صاحب علم و فضل سے معمور گھرانے میں پیدا ہوئے، آپ کے دادا ابو عامر رضی اللہ عنہ شرفِ صحابیت سے فیض یافتہ تھے[3]، جبکہ والد محترم کا شمار صحابہ کرام کے کبار تلامذہ میں ہوتا ہے۔[4]

آپ کے ایک بھائی بھی پختہ عالم دین تھے، امام صاحب بیان فرماتے ہیں:

---

۱ الطبقات لابن سعد:٥/ ٤٦٥، وفيات الأعيان لابن خلكان:٤ / ١٣٥
۲ الثقات لابن حبان:٧/ ٤٥٩، سير أعلام النبلاء:٧/ ١٥٠، تاريخ الإسلام للذهبي:٤/ ٧١٩
۳ الإصابة لابن حجر:٧/ ٢٤٨
٤ مشاهير علماء الأمصار لابن حبان: ص ٢١٢

"ابن شہاب زہری کے ہم عمر میرے ایک بردار تھے۔ والد محترم نے ہمارا امتحان لینے کے لیے ایک دن سوال پوچھا۔ بھائی نے صحیح جواب دیا، جبکہ مجھ سے غلطی ہوئی، تو والد محترم نے فرمایا: تمہیں کبوتروں نے طلبِ علم سے غافل کر دیا ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات بہت ناگوار گزری۔ میں نے علم حاصل کرنے کا عزم باندھا، اور سات آٹھ سال تک ابن ہرمز کی شاگردی اختیار کیے رکھی۔ میں تھیلی میں کھجوریں ڈال کر اُن کی اولاد کو دے دیتا، اور کہتا کہ اگر کوئی شیخ کے بارے میں پوچھے تو کہہ دیں کہ مشغول ہیں۔ ایک دفعہ شیخ نے خادمہ سے کہا کہ دیکھو دروازے پر کون ہے؟ اس نے دیکھا کہ مالک کھڑے ہیں، برہم ہو کر بولی: وہی أشقر (سفید بالوں اور آنکھوں والا) ہے، اور تو کوئی نہیں۔ شیخ نے کہا: اس کو آنے دو، یہ لوگوں میں عالم کا درجہ رکھتے ہیں۔"[1]

امام صاحب سترہ سال کی عمر میں نافع مولیٰ عمر، سعید المقبری، ابن شہاب زہری اور ابن دینار جیسے اجل علما سے شرفِ تلمذ حاصل کر چکے تھے[2]، اور اکیس سال کی عمر میں باقاعدہ درس و تدریس اور مسند افتا سنبھال لی تھی، اور پھر اطراف واکنافِ عالم سے علما و طلبہ آپ کے پاس حاضر ہونا شروع ہوئے۔ اور یہ سلسلہ ابو جعفر المنصور کی خلافت سے لیکر ہارون الرشید کے زمانہ تک عروج کو پہنچا اور آپ کی وفات تک جاری و ساری رہا۔[3]

خود امام صاحب سے طلبِ علم یا درس و تدریس کے لیے سفر کرنا منقول نہیں۔ آپ ساری عمر مدینہ منورہ میں ہی مقیم رہے، سوائے حج کے مکہ مکرمہ کے علاوہ کہیں سفر نہیں کیا۔ بلکہ ایک بار خلیفہ مہدی نے آپ کو بغداد لے جانے کی خواہش ظاہر کی، آپ نے درج ذیل حدیثِ نبوی پڑھ کر یہ پیشکش ٹھکرا دی:

«اَلْمَدِينَةُ خَيْرٌ لَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ».[4]

"کاش لوگ جان لیں کہ مدینہ ان کے لیے بہتر ہے۔"

سراپائے مبارک اور عادات و خصائل

امام صاحب طویل قد، بھاری جسم کے مالک تھے۔ سر اور داڑھی کے بال شدید سفید تھے، لباس بھی عمدہ

---

۱ ترتيب المدارك للقاضي عياض: ۱/ ۱۱۵

۲ تهذيب الأسماء واللغات للنووي: ۲/ ۷۵، تاريخ الإسلام للذهبي: ٤/ ۷۱۹

۳ سير أعلام النبلاء للذهبي: ۷/ ۱۵٤

٤ صحيح مسلم: ۲/ ۹۹۲ (رقم ۱۳٦۳)

سفید زیب تن کیا کرتے۔ انگوٹھی بائیں ہاتھ میں پہنتے، خضاب وغیرہ استعمال نہ کرتے اور مونچھوں کو حلق کرنے کو عیب شمار کرتے تھے۔ آپ کی مجلس انواع واقسام کے قالین وغیرہ سے مزین انتہائی پر تکلف ہوتی۔ شور وغل اور قیل وقال کی ذرا گنجائش نہ تھی۔ سب ادب واحترام اور ہیبت سے خاموش رہتے۔ سوال کرنے کی ہمت نہ تھی۔ باہر سے آنے والے اجنبی اور مہمان لوگ بعض دفعہ حدیث وغیرہ کے متعلق سوال کرلیا کرتے تھے۔ حبیب نامی آپ کے ایک کاتب تھے، وہی آپ کی کتابوں کی قراءت کرتے، باقی سب سماعت فرماتے۔ اگر کہیں غلطی ہوتی تو امام صاحب خود ہی وضاحت فرماتے۔[1]

راوی بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب درسِ حدیث کے لیے باوضو ہوکر بہترین لباس زیب تن کرکے، بالوں کو سنوار کر اور بہترین خوشبو لگا کر نکلتے، اور فرماتے: یہ حدیثِ رسول ﷺ کی تعظیم وتوقیر کا تقاضا ہے۔ اگر کوئی باآواز بلند بولتا تو یہ آیتِ مبارکہ پڑھتے: ﴿لَا تَرْفَعُوٓا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ ٱلنَّبِيِّ﴾ اور فرماتے:

"نبی کریم ﷺ کی حدیث کے پاس رفعِ صوت آپ ﷺ کے پاس رفعِ صوت کے مترادف ہے۔"[2]

شیوخ واساتذہ اور تلامذہ

امام صاحب اساتذہ وشیوخ کے انتخاب میں حد درجہ احتیاط کیا کرتے تھے۔ بہت سارے نیک اور صالح لوگوں کو صرف اس لیے چھوڑ دیا کرتے تھے، کہ ان کی علمی قد وقامت امام صاحب کے ذوق ومزاج کے مطابق نہ ہوتی۔ امام صاحب نے وقت کے جلیل القدر اور اکابر علما ومحدثین سے ہی استفادہ کیا، جن میں سے چند مشاہیر کے نام یوں ہیں: نافع مولیٰ ابن عمر، سعید المقبري، نعیم المجمر، وہب بن کیسان، زہری، ابن المنکدر عبداللہ بن دینار، ایوب سختیانی، ابوالزناد اور ربیعۃ الرأی (الرأي) جیسے علمائے مدینہ۔[3]

امام صاحب کے تلامذہ میں شافعی، ثوری، ابن عیینہ، شعبہ، یحییٰ انصاری، یحیی القطان، ابن مہدی اور ابن مبارک جیسے جلیل القدر ائمہ، محدثین اور فقہا کی ایک طویل فہرست کتب تراجم میں موجود ہے۔[4]

---

١ الطبقات لابن سعد: ٥/ ٤٦٥، ٤٦٨، ٤٦٩

٢ تهذيب الأسماء واللغات: ٢/ ٧٧

٣ تاريخ الإسلام للذهبي: ٤/ ٧١٩

٤ تهذيب الأسماء و اللغات: ٢/ ٧٥

عقیدہ و مسلک

امام صاحب حدیث و سنت، عقیدہ و فقہ کے امام ہیں۔ آپ ان جلیل القدر تبع تابعین میں سے ہیں جو بطورِ اُسوہ و نمونہ اُمت میں مشہور ہوئے۔ مذاہب اربعہ میں سے دوسرا مذہب آپ کی طرف منسوب ہے۔ امام شاطبی نے امام مالک بن انس کا ایک عظیم الشان قول نقل فرمایا ہے:

قبض رسول الله ﷺ وقد تمّ هذا الأمر واستكمل، فينبغي أن تتبع آثار رسول الله ﷺ وأصحابه، ولا يتبع الرأي، فإنه متى ما اتبع الرأي جاء رجل آخر أقوى في الرأي منك فاتبعته، فكلما غلبه رجل اتبعه، أرى أن هٰذا بعد لم يتم.[1]

"نبی کریم ﷺ دین کو مکمل کر کے گئے، لہٰذا نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ہی اتباع کریں۔ رائے اور قیاس کی طرف نہ جائیں، کیونکہ عقل پرستی کوئی معیار نہیں۔ آپ کوئی عقلی نکتہ لائیں گے، کل کو کوئی دوسرا اس کا توڑ لے آئے گا۔ اور عقل تو عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے، لہٰذا انسان کسی ایک بات اور موقف پر مطمئن نہ ہو سکے گا۔"

امام صاحب کا ایک اور قول ہے جو ضرب المثل کی حد تک مشہور ہے، فرماتے ہیں:

"السنّة سفينة نوح من ركبها نجا ومن تخلف عنها غرق."[2]

"سنت تو سفینۂ نوح ہے، جو اس میں سوار ہو گا محفوظ رہے گا، اس سے محروم رہنے والا غرق ہو گا۔"

ہیثم بن جمیل بیان فرماتے ہیں کہ میں نے امام صاحب سے پوچھا: کچھ لوگ عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے اقوال ذکر کرتے ہیں، اور پھر کہتے ہیں کہ ہم ابراہیم کے قول کو لیتے ہیں... کیا یہ درست ہے؟

امام صاحب نے پوچھا: کیا عمر رضی اللہ عنہ کا موقف صحیح سند سے ثابت ہوتا ہے؟ کہا: جی تو فرمایا:

"ایسے لوگوں سے اس منہجی انحراف سے توبہ کروائی جائے جو صحابہ کی بات چھوڑتے ہیں۔"

قلت لمالك بن أنس: يا أبا عبد الله! إن عندنا قومًا وضعوا كتبًا يقول أحدهم ثنا فلان عن فلان عن عمر بن الخطاب بكذا وكذا وفلان عن إبراهيم بكذا، ويأخذ بقول إبراهيم، قال مالك: وصحّ عندهم قول عمر؟ قلت: إنما هي رواية كما

---

١ الاعتصام للشاطبي: ١/ ١٤٠ و٢/ ٦٦٠

٢ ذم الكلام للهروي: ص ٢١٠

صحّ عندهم قول إبراهيم، فقال مالك: هؤلاء يُستتابون.[1]

امام صاحب اتباعِ کتاب وسنت کا درس دیا کرتے تھے:

قال معن بن عيسى: سمعت مالكا يقول: إنما أنا بشر أخطئ وأصيب، فانظروا في رأيي، فكل ما وافق الكتاب والسنة فخذوا به، وكل ما لم يوافق الكتاب والسنة فاتركوه.[2]

"معن بن عیسی بیان کرتے ہیں، امام مالک نے فرمایا: میں ایک انسان ہوں، جس سے درست کے ساتھ ساتھ غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ میرے موقف کو پرکھو، جو کتاب وسنت کے مطابق ہو، اس کو لو، اور کتاب وسنت کے مخالف کو چھوڑ دو۔"

امام صاحب بسا اوقات یہ شعر بھی پڑھا کرتے تھے:

وخير أمور الدين ما كان سنة وشر الأمور المحدثات البدائع[3]

"بہترین دینی کام وہ ہے جو سنت کے مطابق ہو، اور بدترین وہ جو بدعات وخرافات پر مشتمل ہو۔"

علمی مقام اور تعریف وتوصیف

معن بن عیسی فرماتے ہیں کہ مالک ثقہ، ثبت، مامون، پرہیز گار، عالم وحجت تھے۔[4]

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "سنت واثر میں مالک کی حیثیت ایک ستارے کی ہے، اگر مالک اور ابن عیینہ نہ ہوتے تو حجاز علم سے محروم رہتا۔ مالک کو کسی حدیث میں ذرا شک ہوتا، تو مکمل طور پر اس سے کنارہ کشی کر لیتے۔ پھر فرمایا: "مالک میرے معلم ہیں، انہیں سے ہم نے علم حاصل کیا۔"

راوی بیان کرتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ پر کسی کو برتری دینے کے قائل نہ تھے۔

وہب بن خالد کا بیان ہے: "مشرق ومغرب میں مالک سے بڑھ کر حدیثِ نبوی کا کوئی امین موجود نہیں۔"[5]

ایک مشہور حدیث ہے:

---

١ إعلام الموقعين لابن القيم:٢/ ٢٠١

٢ جامع بيان العلم وفضله لابن عبد البر:١/ ٧٧٥

٣ الاعتصام للشاطبي:١/ ١١٥

٤ الطبقات لابن سعد:٥/ ٤٦٩

٥ تهذيب الأسماء واللغات:٢/ ٧٦

«يُوشِكُ أَنْ يَضْرِبَ النَّاسُ أَكْبَادَ الإِبِلِ يَطْلُبُونَ العِلْمَ فَلَا يَجِدُونَ أَحَدًا أَعْلَمَ مِنْ عَالِمِ المَدِينَةِ.»[1]

"لوگ علمی سیرابی کے لیے دور دراز کے سفر کریں گے، لیکن انہیں عالم مدینہ سے بڑھ کر کوئی عالم نہ ملے گا۔"

سفیان بن عیینہ وعبدالرزاق فرماتے ہیں: "یہاں عالم مدینہ سے مراد امام مالک بن انس ہیں۔"[2] ابن عیینہ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ "مالک سے بڑھ کر راویوں میں احتیاط کرنے والا اور ان کا علم رکھنے والا کوئی نہیں۔"[3]

امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ زہری کے تلامذہ میں روایت حدیث میں سب سے زیادہ پختہ کون ہے؟ فرمایا: "مالک بن انس، جو ہر چیز میں پختگی رکھتے ہیں۔"[4]

حماد بن زید خود بہت بڑے محدث ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کی وفات کی خبر ملی، بے ساختہ گویا ہوئے:

"اللہ رحم کرے، اب ان جیسا کوئی نہیں رہا۔"[5]

امام ابن حبان فرماتے ہیں: فقہاے مدینہ میں رواۃ کی جانچ پڑتال کی داغ بیل ڈالنے والے مالک ہیں، جنہوں نے صحیح وضعیف میں امتیاز کا منہج قائم کیا، اور اسی کو امام شافعی رحمہ اللہ نے آگے بڑھایا۔[6]

امام نووی فرماتے ہیں: "مالک کی امامت وجلالت، عظمت وسیادت، تبجیل وتوقیر، حفظ وتثبت کے اقرار واعتراف، اور حدیثِ رسول ﷺ کی تعظیم پر تمام علما کا اتفاق واتحاد ہے۔"[7]

امام ذہبی کی وسعت مطالعہ امام کی شان میں نذرانۂ عقیدت یوں پیش کرتی ہے:

"امام مالک رحمہ اللہ کو کچھ ایسی فضیلتیں حاصل ہوئی ہیں کہ میرے علم کی حد تک دیگر لوگ ان سے محروم رہے ہیں: ایک: طولِ عمر اور علو روایت۔ دوسرا: ذہن رسا وفہم عمیق اور وسعتِ علم۔ تیسرا: تمام علما کا ان کے حجت وصحیح الروایہ ہونے پر اتفاق۔ چوتھا: امام کی دیانت وعدالت اور اتباع سنت پر یک زبان

---

١ سنن الترمذي: ٥/ ٤٧ (٢٦٨٠)، باب ما جاء في عالم المدينة.
٢ سنن الترمذي: ٥/ ٤٧
٣ الجرح والتعديل لابن أبي حاتم: ٨/ ٢٠٤
٤ الجرح والتعديل لابن أبي حاتم: ٨/ ٢٠٥
٥ تهذيب الأسماء واللغات: ٢/ ٧٧
٦ الثقات لابن حبان: ٧/ ٤٥٩
٧ تهذيب الأسماء واللغات: ٢/ ٧٦

ہونا۔ پانچواں: فقہ وفتویٰ اور اُصولِ استدلال میں ان کی مہارت کا اعتراف کرنا۔"[1]

تالیفات

موطا امام کی شہرہ آفاق تصنیف ہے، اس کے علاوہ بھی رسالة في القدر، رسالة في النجوم ومنازل القمر اور الأقضية اور إجماع أهل المدينة کے ناموں سے ان کے رسائل کا ذکر ملتا ہے۔[2] مالکیوں نے امام کے علوم وفنون سے متعلق کئی ایک مجموعے ترتیب دیے ہیں۔ جن میں المدونة سب سے معروف ہے۔

آزمائش اور صبر وثبات

کئی ایک جلیل القدر علما کلمہ حق کہنے کی پاداش میں وقت کے حکمرانوں کے زیر عتاب رہے، امام مالک بھی اُنہیں میں سے ایک ہیں۔ جبری طلاق نہیں ہوتی، امام کا مشہور فتویٰ ہے۔ یہ حاکم وقت کو پسند نہیں تھا، جس کے سبب امام صاحب کو بہت مشقت واذیت کا سامنا کرنا پڑا، اس واقعہ کی تمام تفصیلات قاضی عیاض نے ترتیب المدارك (۲/ ۱۳۰) میں ذکر کی ہیں، حافظ عبد اللہ محدث روپڑی نے اس کا ذکر اپنی کتاب 'حکومت اور علمائے ربانی' (ص ۲۵-۲۹) میں بھی کیا ہے، وہیں سے خلاصۃً اسے یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

بعض فقہا نے ایک ایسا فتویٰ دے دیا کہ اُمراء وسلاطین کی عیاشی وشہوت رانی کے لیے انتہائی زبردست دلیل اور بہترین حربہ ہونے کے ساتھ نصوصِ شرعیہ کے بالکل خلاف ومنافی تھا، فتویٰ کے الفاظ یہ تھے:

"اگر کسی مرد سے زبردستی یا ڈرا دھمکا کر (قتل وغیرہ کا خوف دلا کر) اس کی عورت سے طلاق حاصل کرلی جائے تو ایسی طلاق بالکل حق وصواب اور جائز وصحیح ہے۔"

جب یہ فتویٰ امام دار الہجرۃ کے روبرو پیش ہوا تو آپ نے «لا طلاق ولا عتاق في إغلاق»[3] والی حدیث کے پیش نظر علی الاعلان اس کی تردید وتکذیب کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں فرمایا کہ "طلاق المكرَه ليس بشيء" یعنی جبر واکراہ سے حاصل کردہ طلاق بالکل لغو وباطل ہے۔ ایسی مطلقہ عورت سے نکاح کرنا ویسے ہی حرام وناجائز ہے جیسا کہ عام منکوحہ عورتوں سے شریعت نے حرام وناجائز قرار دے دیا ہے۔

---

۱ تذكرة الحفاظ للذهبي: ۱/ ۱۵۷

۲ ترتيب المدارك وتقريب المسالك للقاضي عياض: ۲/ ۹۰

۳ سنن أبي داود: ۲/ ۲۵۸ (۲۱۹۳)، باب في الطلاق على غلط، سنن ابن ماجه: ۱/ ٦٦٠ (۲۰٤٦)، باب طلاق المكره والناسي. امام البانی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ (إرواء الغليل: ۷/ ۱۱۳ (۲۰٤۷)

نہ صرف یہ بلکہ عالم مدینہ اس حدیث سے یہ فتویٰ بھی دیتے کہ جس طرح طلاق المکرہ غلط و باطل ہے، ویسے ہی بزورِ شمشیر بیعتِ خلافت حاصل کرنے والے خلیفہ کی بیعت بھی شرعاً جائز و صحیح نہیں۔ اور منصور کی بیعتِ خلافت چونکہ جبر و اکراہ پر مبنی تھی، اس لیے عالم مدینہ کے دونوں اعلانات بظاہر حکومت کو کھلا چیلنج تھے، اور اس طرفہ پر طرہ یہ ہوا کہ ان دنوں مدینہ منورہ کا گورنر جعفر بن سلیمان تھا جو منصور عباسی کا چچازاد بھائی تھا۔ جب دونوں اعلانات اس نے سنے تو شاہی قرابت اور حکومت کے نشہ سے سرشار اس نے امام صاحب کو انتباہی نوٹس دیا کہ اپنے فتویٰ سے رجوع کریں یا کم از کم آئندہ ایسا فتویٰ نہ دیں۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا وجود ہی فطرتاً کتاب و سنت کی نشر و اشاعت کے لیے مختص تھا، بنابریں آپ نے گورنر جعفر بن سلیمان کے انتباہی نوٹس کی ایک ذرہ پروا نہ کی، بلکہ مزید جوش و خروش سے ردّ و تردید کرتے ہوئے کھلم کھلا اعلان کرتے رہے: طلاق المکرہ لیس بشيء یعنی جبر و اکراہ سے حاصل کردہ طلاق غلط و باطل ہے۔ جعفر شاہی آرڈر کی توہین دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا اور پولیس کو حکم دیا کہ امام صاحب کو اخلاقی مجرم کی حیثیت سے انتہائی ذلیل کن حالت میں پیش کیا جائے۔ امام صاحب کو لایا گیا، جعفر نے اپنا مطالبہ دہرایا۔ امام صاحب نے پھر اسی شان سے اسے ٹھکرا دیا، اور فرمایا: اگر تمہارے مفتیوں کے پاس کوئی نص قطعی موجود ہے تو پیش کرو، ورنہ ہم فتویٰ کو واپس لینے یا اس سے باز رہنے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔

والی مدینہ نے زچ ہو کر امام صاحب کو مار پیٹ کا حکم دے دیا۔ امام صاحب کو ڑوں کی ضرب سے چلانے کی بجائے طلاق المکرہ لیس بشيء کے نعرے بلند کرتے جاتے۔ اپنی خفت و ندامت کو مٹانے کے لیے ظالم وقت نے حکم دیا کہ اس باغی کا منہ کالا کر کے پورے شہر میں گھمایا جائے۔ امام صاحب وہاں بھی سرعام یوں فرمانے لگے: "مجھے جاننے والے تو خوب جانتے ہیں، جو نہیں جانتا وہ سن لے کہ میں مالک بن انس اصبحی ہوں، اور ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ جبر و اکراہ کی طلاق کی کوئی حیثیت نہیں۔" والی مدینہ کو خبر کی گئی کہ تم نے امام کو ذلیل و رسوا کرنے کا پلان کیا تھا، لیکن امام اُلٹا حکومت کے ظلم و غصب کی داستان گلی کوچوں میں بیان کر رہے ہیں، تو والی مدینہ نے کہا کہ امام صاحب کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ حکومتی کارندوں سے خلاصی پاتے ہی امام صاحب مسجدِ نبوی گئے وہاں بطورِ شکرانہ دو گانہ ادا کیا۔ خلیفہ منصور کو جب یہ صورت حال پہنچی تو بہت برہم ہوا، اور والی مدینہ جعفر کو کہلا بھیجا کہ تمہاری بیوقوفی کی یہ سزا ہے کہ ابھی فوراً گدھے پر سوار ہو کر دار الخلافہ بغداد حاضری دو، خلیفہ منصور نے جعفر بن سلیمان کو معزول کر دیا اور خود مدینہ حاضری دے کر امام صاحب سے معذرت خواہ ہوا۔

یہ تھا وقت کے امام ہمام مالک بن انس کا وقت کے حکمران سے تعامل، ان کی شجاعت و بہادری اور کلمہ حق سے دین کا سربلند ہوا، اور وقت کے حکمران کو ذلت و پستی کا سامنا کرنا پڑا۔

وفات

علم و عمل اور اشاعتِ کتاب و سنت سے بھرپور ۸۵ سالہ زندگی گزار کر امام مالک ۱۴ ربیع الاول ۱۷۹ھ میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔ یہ خلیفہ ہارون الرشید کا زمانہ تھا، مدینہ کے والی عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم عباسی تھے۔ انہوں نے امام صاحب کا جنازہ مسجد نبوی میں پڑھایا، اور آپ کو مسجد نبوی سے ملحق بقیع الغرقد قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔[1]

(۲) موطا امام مالک کا تعارف

نام، وجہ تسمیہ اور تلفظ

اس مایہ ناز کتاب کا نام 'موطا' ہے، جس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کی نسبت سے اسے 'موطا امام مالک' بھی کہا جاتا ہے۔ البتہ بعض دفعہ موطا کی نسبت امام صاحب کے بعض تلامذہ یعنی راویانِ موطا کی طرف بھی کر دی جاتی ہے، مثلاً کہا جاتا ہے: 'موطا امام محمد' لیکن بہتر یہ ہے کہ 'موطا مالک بروایتِ محمد' جیسی کوئی تعبیر استعمال کی جائے، تاکہ کسی قسم کا کوئی اشکال پیدا نہ ہو کیونکہ امام محمد کی موطا نامی کتاب کوئی مستقل تصنیف نہیں، بلکہ وہ موطأ مالک کی ایک روایت ہے۔ جس میں ۳۶۸۶ کی بجائے ۱۰۰۸ مرویات[2] ہیں۔

موطأ نام کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ موطأتو طِئة سے ہے، جس کا مطلب ہے "کسی چیز کو آسان و میسر کر دینا۔"[3] چونکہ امام صاحب کا مقصد حدیث و فقہ کو ایک سہل اُسلوب میں پیش کرنا تھا، اس لیے اس کا

---

۱ الطبقات لابن سعد: ۵/ ۴۶۹، الثقات لابن حبان: ۷/ ۴۵۹

۲ امام محمد نے امام مالک سے تقریباً تین سال تک علم حاصل کیا، اور ان کے بقول انہوں نے امام صاحب سے ۷۰۰ سے زائد احادیث سماعت کیں۔ (سیر اعلام النبلاء: ۸/ ۷۵)، موطا بروایۃ محمد مطبوعہ میں مرویات کی تعداد ۱۰۰۸ ہے لیکن اس میں کافی ساری روایات امام محمد کی 'زیادات' ہیں۔ جیسا کہ حدیث نمبر ۱۳ تا ۳۴ میں سے ایک بھی امام مالک کے طریق سے نہیں ہے۔ کتب حدیث میں یہ منہج عام ہے کہ بعض دفعہ راوی کتاب اپنے شیخ کی روایات کے ساتھ ساتھ اپنی سند سے بھی احادیث درج کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ مسند احمد میں امام کے صاحبزادے عبد اللہ کی زیادات مشہور ہیں۔ موطا کی مختلف روایات میں موجود مرویات کے تقابل کے لیے اس مضمون کا 'روایاتِ موطا' والا حصہ ملاحظہ کریں۔

۳ لسان العرب لابن منظور: ۱/ ۱۹۵

نام موطأ رکھا گیا۔[1] ایک اور وجہ تسمیہ بھی بیان کی جاتی ہے جو کہ امام صاحب کے درج ذیل قول سے ماخوذ ہے:

"عرضت كتابي هٰذا على سبعين فقيهًا من فقهاء المدينة فكلّهم واطأني عليه فسميته الموطأ."[2]

میں نے یہ کتاب مدینہ کے ستر فقہا کے سامنے پیش کی، سب نے اس کے متعلق رضامندی و موافقت کا اظہار کیا، لہذا اس کا نام 'موطأ' رکھ دیا۔

اس طرح یہ موطا مواطأة یعنی موافقة سے ہو گا، لیکن اس میں ایک اشکال ہے کہ مواطأة باب مفاعلة ہے، جبکہ موطأ باب تفعیل سے ہے جس کا حل یوں کیا جاسکتا ہے کہ توطئة باب تفعیل کو 'تنقیح و تحریر' کے معنی میں لیا جائے، اور یہ توجیہ کی جائے کہ جب ستر فقہائے مدینہ نے کتاب کے مندرجات کو دیکھا، اس کی جانچ پڑتال کی، تو گویا وہ تنقیح و تحریر کے بعد موطأ کہلانے کی حقدار ٹھہری۔ واللہ اعلم!

یہاں یہ فائدہ بھی قابل ذکر ہے کہ لفظ موطأ میں لغوی طور پر دو وجہیں جائز ہیں: ایک الموطأ واو کے ساتھ، اور دوسرا المؤطأ ہمزہ کے ساتھ، جیسا کہ قرآن کریم میں ﴿وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتْ﴾ میں وُقِّتَت بھی جائز ہے۔[3] اور دونوں کے مفہوم میں فرق کوئی فرق نہیں۔

سبب تالیف

موطا کے سبب تالیف کے بیان میں ایک سے زائد روایات ہیں: ایک یہ ہے کہ امام صاحب نے یہ کتاب عباسی خلیفہ ابو جعفر المنصور کے کہنے پر تصنیف فرمائی تھی۔ دوسری روایت کے مطابق یہ گزارش خلیفہ مہدی نے کی تھی[4]۔ ایک تیسری روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ امام صاحب نے عبد العزیز ابن الماجشون کی موطأ دیکھی، تو انہیں احساس ہوا کہ اس موضوع پر مزید بہترین کتاب ہونی چاہیے، اور پھر آپ نے موطا کی تصنیف کا آغاز کیا۔[5]

ان تینوں روایات میں جمع و تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ پہلے ابو جعفر المنصور نے امام صاحب سے یہ

---

١ ترتيب المدارك: ٢/ ٧٣

٢ تنوير الحوالك للسيوطي: ١/ ٧

٣ شذا العرف في فن الصرف لأحمد الحملاوي: ١٢٥

٤ ترتيب المدارك: ٢/ ٧١-٧٣

٥ التمهيد: ١/ ٨٦، ترتيب المدارك: ٢/ ٧٦

گزارش کی ہوگی، لیکن امام صاحب سوچ و فکر میں ہوں گے۔ پھر بعد میں خلیفہ مہدی نے بھی یہی طلب دہرائی تو امام صاحب کا عزم مزید پختہ ہوا، اور پھر جب آپ نے اس وقت کی تصنیفات دیکھیں تو ان میں سب سے بہترین موطا ابن الماجشون محسوس ہوئی، لیکن ساتھ اس میں موجود بعض کوتاہیوں کو دیکھ کر ایک جامع اور آسان موطا تالیف کرنے کا آغاز کر دیا۔ واللہ اعلم!

موطا کو دستور بنانے کی پیشکش

امام صاحب کے سوانح نگاروں نے یہ بات بھی نقل کی ہے کہ ابو جعفر المنصور نے امام صاحب کو پیش کش کی تھی کہ آپ اجازت دیں، تو موطا کو بطور دستور اور آئین کے نافذ کر دیا جائے، لیکن امام صاحب نے رضامندی ظاہر نہ کی۔ ابن سعد اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

"مالک بیان کرتے ہیں کہ حج کے موقعہ پر ابو جعفر المنصور نے مجھے بلوایا اور کہا: میرا عزم ہے کہ آپ کی کتاب یعنی موطا کے نسخے تیار کروا کر تمام اسلامی علاقوں میں بھیجوں اور اسے نافذ کرنے کا حکم جاری کر دوں، کیونکہ اصل علم تو مدینہ میں ہے۔ میں نے عرض کی: امیر المؤمنین یہ کام نہ کیجیے، کیونکہ اقوال، احادیث و روایات کا علم تمام لوگوں میں منتشر ہو چکا ہے، اور ہر ایک نے اپنے علم و فہم کے مطابق موقف بنالیا ہے، ایسی صورت حال میں لوگوں کا اپنے ہاں رائج الوقت طریقے سے دستبردار ہونا بہت مشکل ہوگا، لہٰذا ہر شہر کو اپنے علمی و فقہی اختیارات کے مطابق ہی رہنے دیا جائے۔ ابو جعفر نے کہا: بخدا اگر آپ اجازت دیتے تو میں اسے نافذ کر کے ہی رہتا۔"

امام صاحب کے الفاظ یوں ہیں:

يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! لاَ تَفْعَلْ هَذَا فَإِنَّ النَّاسَ قَدْ سَبَقَتْ إِلَيْهِمْ أَقَاوِيلُ وَسَمِعُوا أَحَادِيثَ وَرَوَوْا رِوَايَاتٍ وَأَخَذَ كُلُّ قَوْمٍ بِمَا سَبَقَ إِلَيْهِمْ وَعَلِمُوا بِهِ وَدَانُوا بِهِ مِنِ اخْتِلاَفِ النَّاسِ وَغَيْرِهِمْ وَإِنَّ رَدَّهُمْ عَمَّا قَدِ اعْتَقَدُوهُ شَدِيدٌ فَدَعِ النَّاسَ وَمَا هُمْ عَلَيْهِ وَمَا اخْتَارَ كُلُّ أَهْلِ بَلَدٍ مِنْهُمْ لأَنْفُسِهِمْ.[1]

یہی بات الفاظ کے ذرا اختلاف سے امام کے تلامذہ ابو مصعب الزہری، الحارث بن مسکین اور محمد بن مسلمۃ

---

١ الطبقات لابن سعد: ٩/ ٤٤١

القعنبی وغیرہ سے بھی مروی[1] ہے۔ الغرض امام صاحب اپنی کتاب کو بطور قانون اور دستور نافذ کرنے پر راضی نہ ہوئے، کیونکہ وحی کے علاوہ کوئی چیز بطور شریعت نافذ نہیں کی جاسکتی ہے، اور امام صاحب خود مسجد نبوی میں لوگوں کو قبر نبوی کی طرف اشارہ کر کر کے یہی منہج سکھاتے رہے کہ

"كُلُّ أَحَدٍ يُؤْخَذُ مِنْ قَوْلِهِ، وَيُتْرَكُ، إِلاَّ صَاحِبَ هَذَا القَبْرِ ﷺ."[2]

"اس صاحب قبر ﷺ کے علاوہ ہر ایک کی بات میں اخذ ورد کا احتمال باقی رہتا ہے۔"

موضوعاتِ کتاب

اجمالی طور پر تو کتاب کا موضوع احادیث رسول ﷺ و آثارِ صحابہ کا بیان ہے، البتہ تفصیلی طور پر مضامین موطا کو آٹھ قسموں میں بیان[3] کیا جاسکتا ہے:

پہلی قسم: مرفوع و متصل احادیث	دوسری قسم: مرسل احادیث
تیسری قسم: منقطع احادیث	چوتھی قسم: مرفوع حکمی
پانچویں قسم: بلاغیات	چھٹی قسم: اقوالِ صحابہ و تابعین
ساتویں قسم: امام مالک کا تفقہ و اجتہاد	آٹھویں قسم: لغوی و تفسیری افادات

کتاب کا طریقۂ تالیف اور مصنف کی شرط

امام صاحب نے کتاب کو فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے۔ صرف احادیثِ صحیحہ پر اکتفا کرنے کی بجائے اقوالِ صحابہ و تابعین بھی ذکر کیے ہیں۔ مسند کے ساتھ ساتھ مرسل حدیث سے بھی احتجاج کرتے ہیں، اسی طرح سیدنا عمر فاروقؓ اور عبداللہ بن عمرؓ[4] سے وارد مسائل سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ اہل مدینہ صحابہ و تابعین کے فتاویٰ سے زیادہ مانوسیت رکھتے ہیں بالخصوص اگر کسی مسئلہ میں فقہاے سبعہ کا اتفاق ہو جائے۔[5]

---

١ ترتيب المدارك: ١/ ٦٠، سير أعلام النبلاء: ٨/ ٧٩

٢ سير أعلام النبلاء: ٨/ ٩٣

٣ كشف المغطى لابن عاشور: ٢٩، والمدخل إلى موطأ مالك بن أنس: ص ٩١-٩٣

٤ امام صاحب فرماتے ہیں، عمر فاروقؓ امامت کے درجہ پر فائز تھے، ان کے بعد زید بن ثابتؓ ہوئے، پھر عبداللہ بن عمرؓ۔ امام صاحب کے الفاظ یوں ہیں: "كان إمام الناس عندنا بعد عمر بن الخطاب زيد بن ثابت - يعني بالمدينة -. قال: وكان إمام الناس بعده عندنا عبد الله بن عمر. (الإستيعاب في معرفة الأصحاب: ١/ ١٦٠)

٥ كشف المغطى لابن عاشور: ص ٢٢- ٢٨، والمدخل إلى موطأ مالك بن أنس: ص ٧٩-١٠١

امام صاحب نے احادیث نبویہ پر اکتفا کی کرنے کی بجائے اقوال صحابہ و تابعین کو اس لیے ذکر کیا، کیونکہ یہ اسلامی فقہی مصادر میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، اس کے بغیر تفقہ فی الحدیث ممکن نہیں، امام کا مقصد صرف نصوصِ شریعت کی تدوین نہ تھا، بلکہ آپ نصوص سے مسائل کے استنباط و استدلال کے لیے ایک جامع طرز اُسلوب متعارف کروانا چاہتے تھے۔

ابن العربی رقم طراز ہیں: قَصَدَ في كتابِه هذا تبيينَ أصولِ الفقهِ وفروعِهِ.[1]

"امام کا اس کتاب کی تالیف سے مقصد فقہ کے اصول و فروع کا بیان تھا۔"

امام ابن عاشور فرماتے ہیں:

"امام صاحب کا مقصد علمِ شریعت کی وضاحت تھی، اور علم شریعت صرف احادیث نبویہ میں ہی منحصر نہیں، بلکہ صحابہ کرام جنہوں نے نبی کریم ﷺ کے معاملات و عادات کو براہ راست ملاحظہ کیا، ان کے فیصلے اور فتاوی بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔"[2]

احادیثِ موطا کا درجہ

جیسا کہ گزر چکا کہ احادیثِ موطا کی مختلف آٹھ اقسام ہیں، تو ہر قسم کا درجہ بھی الگ ہے، لہٰذا پہلی قسم یعنی مرفوع و متصل احادیث سب کی سب صحیح ہیں، اور علما کا اس پر اتفاق ہے، بلکہ یہ تمام احادیث صحیحین بلکہ کتبِ ستہ میں بھی موجود ہیں۔[3]

بلکہ امام بخاری کے طریقہ تالیف میں یہ بات مذکور ہے کہ انہیں اگر امام مالک کی روایت سے کوئی حدیث مل رہی ہو، تو وہ اسی کو ذکر کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، چاہے امام مالک کی روایت کے لیے انہیں نَازِل یعنی لمبی سند ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ ابن عاشور فرماتے ہیں:

"امام بخاری تکلفاً مالک کی روایت کو لیتے ہیں، چاہے ان کو بعید ترین سند کا ہی سہارا کیوں نہ لینا پڑے۔"[4]

رہی بات موطا میں موجود مُرسَل احادیث کی، تو اس کے متعلق موطا کے رازدان و ماہر ابن عبد البر فرماتے

---

١ المسالك في شرح موطأ مالك لابن العربي: ١/ ٤٣٦

٢ كشفي المغطى: ص٤٠

٣ كشفي المغطى: ص٢٩

٤ كشفي المغطى: ص٣٠

ہیں کہ موطا کی مراسیل دیگر متصل اسانید سے بھی ثابت ہیں، یہی وجہ ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان فرمایا کرتے تھے: "مالک کی مراسیل مجھے سب سے عزیز ہیں، کیونکہ ان سے صحیح مراسیل کسی کی نہیں"[1]، البتہ درج ذیل حدیث: عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ أَبِي بُرْدَةَ الْكِنَانِيِّ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَى النَّاسَ فِي قَبَائِلِهِمْ يَدْعُو لَهُمْ وَأَنَّهُ تَرَكَ قَبِيلَةً مِنَ الْقَبَائِلِ قَالَ وَإِنَّ الْقَبِيلَةَ وَجَدُوا فِي بُرْدَغَةِ رَجُلٍ مِنْهُمْ عِقْدَ جَزْعٍ غُلُولًا فَأَتَاهُمْ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَبَّرَ عَلَيْهِمْ كَمَا يُكَبِّرُ عَلَى الْمَيِّتِ کی ابن عبد البر کو کہیں مسند نہیں ملی۔[2]

رہی منقطع احادیث تو اس حوالے سے قاضی عیاض کا کہنا ہے کہ "ابن مسعود کے اقوال امام صاحب نے عبد اللہ بن ادریس اودی کے واسطہ سے روایت کیے ہیں، اور بقیہ اصحاب کے آثار عبد الرحمٰن بن مہدی کے توسط سے"[3]۔ گویا قاضی عیاض یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ موطأ میں منقطع احادیث کی اسانید بھی معروف ہیں، امام صاحب نے شاید شہرت کی بنا پر انہیں ذکر نہیں کیا۔ واللہ اعلم!

موطا میں بلاغات کی تعداد ۲۳۹ ہے[4]، حافظ ابن عبد البر نے ان تمام کی اسانید ذکر کر دی ہیں، البتہ چار کی اسانید انہیں نہیں مل سکیں:

١: "إني لا أنسى ولكن أنسى لأسن."[5]

٢: "إذا نشأت بحرية ثم تشاءمت فتلك عين غديقة."[6]

٣: "أن رسول الله ﷺ أري أعمار الناس قبله فكأنه تقاصر أعمار أمته، أن لا يبلغوا من العمل مثل الذي بلغه غيرهم في طول العمر فأعطاه الله ليلة القدر خيرًا من ألف شهر."[7]

٤: أن معاذ بن جبل قال: آخر ما أوصاني به رسول الله ﷺ: و قد وضعت رجلي

---

١ سنن الترمذي: ٥/ ٧٥٤

٢ التمهيد: ٢٣/ ٤٢٩

٣ ترتيب المدارك: ٢/ ٧٥

٤ یہ تعداد شیخ سلیم ہلالی کی تحقیق سے شائع شدہ موطا میں دی گئی فہرست سے شمار کی گئی ہے۔

٥ الموطأ: ٢/ ١٣٨ (رقم ٣٣١)

٦ الموطأ: ٢/ ٢٦٩ (رقم ٦٥٤)

٧ الموطأ: ٣/ ٤٦٢ (رقم ١١٤٥)

في الغرز أن قال: «حسّن خلقك للناس».'[1]

بعد والے علما کو ان چار احادیث کی اسانید بھی مل گئی تھیں، حافظ ابن صلاح کا اس حوالے سے ایک مستقل رسالہ ہے جس میں یہ تفصیلات موجود ہیں۔ ان چار احادیث کے متعلق ابن صلاح کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ دو اور تین نمبر احادیث کی اسانید ضعیف ہیں، جبکہ پہلی حدیث صحیح اور چوتھی حدیث حسن درجے کی ہے۔[2]

موطا کی قدر و منزلت

کتبِ حدیث میں موطأ اعلیٰ منزلت پر فائز ہے، بالکل ابتدائی مصادر حدیث میں سے ہے۔ فقہ و حدیث کی جامع پہلی کتاب ہے، امام شافعی فرمایا کرتے تھے:

ما في الأرض كتاب في العلم أكثر صوابًا من موطأ مالك.[3]

"روے زمین پر موطا سے صحیح ترین کتاب موجود نہیں ہے۔"

امام ابن العربی فرماتے ہیں:

"بخاری دوسرے نمبر پر جبکہ موطا پہلے نمبر پر ہے، بعد والی تمام کتبِ حدیث کی بنیاد موطا ہی ہے۔"[4]

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ موطا کو صحیحین پر ترجیح اس بنیاد پر ہے کہ موطا اَسبق و اَقدم ہے، اور متقدم ہونا بذاتِ خود ایک فضیلت ہے، کیونکہ بعد والے سب اوّلین کے خوشہ چین ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کی کتبِ حدیث میں کوئی ایک ایسی نہ ہوگی جس میں امام مالک رحمہ اللہ اور موطأ کی روایات موجود نہ ہوں، اس اعتبار سے موطأ کو افضل کہا جاسکتا ہے، ورنہ عمومی اعتبار سے یہی بات درست ہے کہ

"صحیح بخاری و مسلم قرآن کے بعد افضل ترین کتابیں ہیں، جیسا کہ اس پر امت کا اجماع ہے۔"[5]

ذہبی فرماتے ہیں: "موطا کی لوگوں کے ہاں شان، اور دلوں میں جو ہیبت و وقار ہے، یہ اسی کا خاصہ ہے۔"[6]

حجۃ الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

١ الموطأ: ٥/ ١٣٢٧ (٣٣٥٠)
٢ وصل بلاغات مؤطا لابن الصلاح: ص ٧
٤ سير أعلام النبلاء: ٨/ ١١١
٤ عارضة الأحوذي لابن العربي: ١/ ٥
٥ شرح النووي على مسلم: ١/ ١٤
٦ سير أعلام النبلاء: ١٨/ ٢٠٢

"یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کتبِ فقہ میں موطا امام مالک کے پائے کی کوئی کتاب نہیں ہے، کیونکہ کتاب کی فضلیت کے کچھ معیارات ہیں، مثلاً اس کا مصنف عظیم شخصیت ہو، یا کتاب میں صحت کا التزام ہو، یا اس کی احادیث مشہور ہوں، یا عامۃ المسلمین کے ہاں اسے قبولِ عام حاصل ہو، یا اس میں اہم مقاصدِ دین کا استیعاب ہو وغیرہ، یہ جتنی خوبیاں ہیں، موطا میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔"[1]

صحیح بات یہ ہے کہ موطأ میں چونکہ صرف صحیح احادیث پر اکتفا نہیں کیا گیا، اس لیے صحیحین کو اس پر فوقیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے علامہ کتانی نے صحیحین کے بعد موطا کو تمام کتبِ حدیث پر فوقیت دی ہے۔[2]

موطا میں امام صاحب کے شیوخ

امام ذہبی رحمہ اللہ اور امام غافقی نے موطا میں امام صاحب کے شیوخ کی فہرست مرتب کی اور ان سے مروی روایات کی تعداد ذکر کی ہے۔ ذہبی نے ۹۴ رواۃ کا ذکر کیا ہے[3] جبکہ غافقی نے ۹۲ بیان کیے ہیں۔[4] غافقی کی فہرست میں ۷ ایسے نام ہیں جنہیں ذہبی نے ذکر نہیں کیا، اور ذہبی نے دس ایسے نام ذکر کیے ہیں، جو غافقی کی فہرست میں نہیں ہیں۔ اس طرح یہ کل ملا کر تقریباً ۱۰۲ شیوخ بن جاتے ہیں، جن سے امام مالک نے موطا میں روایات بیان کی ہیں۔

روایاتِ موطا

موطا کی تالیف کے زمانے سے ہی اہل علم نے اس کی روایت و تحدیث کا اہتمام کیا، امام صاحب کے تلامذہ ایک دوسرے سے بڑھ کر موطأ کی روایت وعنایت کرتے رہے۔ حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"احادیث موطا، فقہی مسائل و فتاوی کی روایت کرنے والوں کو امام دار قطنی نے ایک تصنیف میں جمع کیا ہے، جن کی تعداد تقریباً ہزار کے قریب ہے۔"[5]

راویوں کی کثرت کے سبب موطا کے نسخوں اور روایتوں میں اختلاف بھی موجود ہے، قاضی عیاض مالکی

---

١ المسوى لولي الله الدهلوي: ١٧
٢ الرسالة المستطرفة لمحمد بن جعفر الكتاني: ١٣
٣ سير أعلام النبلاء: ٧/ ١٥٠-١٥٢
٤ الموطآت لنذير حمدان: ٢٠٤-٢٠٨
٥ الانتقاء لابن عبد البر: ١٥، ط. العلمية

(م ۵۴۳ھ) نے اس حوالے سے کافی تحقیق کی ہے، اور ان کے دور یعنی چھٹی صدی ہجری میں موطأ کے تیس کے قریب نسخے شمار کیے جاتے تھے، جن میں سے بیس خود قاضی عیاض کی دسترس میں تھے۔[1]

روایاتِ موطأ میں سب سے مشہور روایت یحیی بن یحیی اللیثی رحمہ اللہ کی ہے، جب مطلقاً موطأ کہا جائے تو یہی روایت مراد ہوتی ہے، جبکہ دیگر روایات ذکر کرتے ہوئے ساتھ راویوں کی صراحت کر دی جاتی ہے۔

روایاتِ موطا پر مستقل تصانیف بھی ہیں، أنوار المسالك إلى روايات موطأ مالك میں ۱۶ روایات کا تذکرہ ہے، اسی طرح شیخ سلیم بن عید ہلالی کی تحقیق سے شائع شدہ موطا میں دو روایات کا مزید اضافہ ہے، اس طرح یہ کل اٹھارہ روایت بن جاتی ہیں۔ ذیل میں ایک جدول کی شکل میں ان روایات کو ذکر کیا جاتا ہے، ساتھ نصوص کی تعداد اور مطبوع و مخطوط کی معلومات کا بھی حسبِ استطاعت اضافہ کر دیا گیا ہے:

ن	راوی موطأ کا نام مع سن وفات	حالت	تعداد نصوص
۱	رواية يحيى بن يحيى الليثي (ت ۲۳۳هـ)	مطبوعہ	۳۶۷۶ (ط. الأعظمي)
۲	رواية محمد بن الحسن الشيباني (ت ۱۷۹هـ)	مطبوعہ	۱۰۰۸ (ط عبد الوهاب)
۳	رواية أبي مصعب الزهري (ت ۲۴۱هـ)	مطبوعہ	۳۰۶۹ (ط بشار عواد)
۴	رواية سعيد بن عفير الأنصاري (ت ۲۲۶هـ)	نامعلوم	
۵	رواية سليمان بن برد المصري (ت ۲۱۰هـ)	نامعلوم	
۶	رواية عبد الرحمٰن بن القاسم (ت ۱۹۱هـ)	مطبوعہ	۵۲۷ (ط علي زئي)
۷	رواية عبدالله بن مسلمة القعنبي (ت ۲۲۱هـ)	مطبوعہ	۶۹۵ (ط التركي)
۸	رواية عبدالله بن وهب القرشي (ت ۱۹۷هـ)	مخطوطہ	مرکز ودود للمخطوطات
۹	رواية عبد الله بن يوسف التنيسي (ت ۲۱۸هـ)	نامعلوم	
۱۰	رواية محمد بن المبارك الصوري (ت ۲۱۵هـ)	نامعلوم	
۱۱	رواية مصعب بن عبدالله الزبيري (ت ۲۳۰ هـ)	نامعلوم	
۱۱	رواية مطرف بن عبدالله المدني (ت ۲۲۰ هـ)	نامعلوم	
۱۲	رواية معن بن عيسى القزاز (ت ۱۹۸هـ)	نامعلوم	

۱ ترتيب المدارك: ۸۸،۸۹/۲

۱۳	رواية يحيى بن بكير المصري (ت ۲۱۳ھ)	مطبوعہ	غیر شمار کردہ (ط الهلالي)
۱۴	رواية يحيى بن يحيى النيسابوري (ت ۲۲٦ھ)	نامعلوم	
۱۵	رواية أبي حذافة أحمدبن إسماعيل السهمي (ت۲۵۹ھ)	نامعلوم	
۱٦	رواية علي بن زياد أبو الحسن العبسي (ت۱۹۰ھ)	مطبوعہ	غیر شمار کردہ (ط الهلالي)
۱۷	سويد بن سعيد أبو محمد الحدثاني (ت ۲٤۰ھ)	مطبوعہ	غیر شمار کردہ (ط الهلالي)

موطا کی مختلف روایات میں احادیث کی تعداد میں کافی فرق کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب سے ان لوگوں نے مختلف اوقات میں کتاب سنی، اور امام صاحب اس میں مسلسل حک واضافہ کرتے رہتے تھے۔[1]

شروحاتِ موطا

شروع سے لیکر اب تک علما مختلف انداز سے موطا کی خدمت سرانجام دیتے رہے ہیں: کسی نے شرح کی، کسی نے رجالِ موطا کے حالاتِ زندگی لکھے، کسی نے مراسیل ومنقطعات کی اسانید کا اہتمام کیا، کسی نے اطراف الموطا، وترتیب المسانید پر کام کیا۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں:

"کتب حدیث میں جو اہتمام موطا کے ساتھ رہا ہے، وہ کسی اور کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔ موافق و مخالف سب اس کی قدر ومنزلت، روایت کرنے، اور احادیث کو ماننے پر متفق ہیں۔"[2]

بعض محققین نے شروحاتِ موطا کی تعداد ۱۳۰ بیان کی[3] ہے، چند اہم کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

تفسير غريب الموطأ لمحمد بن عبدالسلام (سحنون) القيرواني (ت ۲٦۵ھ)

مسند الموطأ لأبي القاسم الجوهري الغافقي (ت ۳۸۱ھ)

التمهيد لما في الموطأ من المعاني والأسانيد لابن عبد البر (ت ٤٦۳ھ)

الاستذكار للحافظ ابن عبد البر (ت ٤٦۳ھ)

المنتقى لأبي الوليد الباجي (ت٤٧٤ھ)

الإيماء في أطراف الموطأ لأحمد بن طاهر الداني (ت۵۲۰ھ)

---

۱ ترتيب المدارك: ۱/ ٦۰

۲ ترتيب المدارك: ۲/ ۸۰

۳ تفسير غريب الموطا لابن حبيب الأندلسي، مقدمة التحقيق: ص۶۳ تا ۱۵۰

القبس في شرح موطأ مالك بن أنس لابن العربي (ت ٥٤٣هـ)
الدرة الوسطى في مشكل الموطأ لمحمد بن خلف القرطبي (ت ٥٥٧هـ)
المشروع المهيأ في ضبط مشكل رجال الموطأ لابن مخلوف التلمساني(ت ٨٦٨ هـ)
تنوير الحوالك للسيوطي (ت ٩١١هـ)
أنوار كواكب نهج السالك بشرح موطأ مالك للزرقاني (ت ١١٢٢هـ)
إرشاد السالك لشرح مقفل موطأ مالك لعلي بن أحمد الفأسي (ت ١١٤٣هـ)
التعليق الممجد على موطأ محمد لعبد الحي اللكنوي (ت ١٣٠٤هـ)
أوجز المسالك بشرح موطأ مالك لزكريا الكاندهلوي (ت ١٣٤٨هـ)
ضوء السالك لمحمد رفيق الأثري حفظه الله

طبعاتِ کتاب

موطا کی کئی طبعات (ایڈیشن) ہیں، چند اہم کا تذکرہ ذیل میں موجود ہے:

الموطأ، بترتيب الشيخ فواد عبد الباقي، طبعة مطبعة البابي الحلبي وغيره.
الموطأ، بتحقيق الشيخ الأعظمي، موسسة زايد، أبو ظبي، الإمارات.
الموطأ برواية الليثي، بتحقيق الشيخ بشار عواد، طبعة مؤسسة الرسالة، بيروت.
الموطأ بروايتها الثمانية (الليثي، والقعنبي، وأبي مصعب الزهري، والحدثاني، وابن بكير، وابن القاسم، وابن زياد، ومحمد بن الحسن) بتحقيق سليم بن عيد الهلالي، طبعة مكتبة الفرقان بالأمارات.
الموطأ برواية ابن القاسم، بتحقيق و تخريج و ترجمة الشيخ زبير علي زئي، المكتبة الإسلامية، لاهور، باكستان.
الموطأ برواية الشيباني، بتحقيق الشيخ عبدالوهاب عبد اللطيف، المكتبة العلمية.
الموطأ برواية القعنبي، بتحقيق عبدالمجيد التركي، دار الغرب الإسلامي، بيروت

آدابِ اختلاف اور دعوتِ دین ②

وٹس ایپ گروپ سے وابستہ اہل علم و دانش کی تربیتی ملاقات

عبدالرحمٰن عزیز

دوسری قسط

دوسری نشست: علمی اختلاف اور اس کے آداب

زیر صدارت: مولانا حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

مہمانانِ گرامی: مولانا سعید مجتبیٰ سعیدی، مولانا عبدالغفار اعوان مدنی

دوسری نشست کا آغاز نمازِ ظہر کے بعد ہوا جس کی نقابت کی ذمہ داری شیخ عبدالرزاق گھمن نے ادا کی۔

پہلا خطاب: 'آدابِ اختلاف کی اہمیت اور ضرورت' از ڈاکٹر مسعود عبدالرشید اظہر حفظہ اللہ

اُنہوں نے فرمایا: یہ کائنات طرح طرح کے اختلافات کا مجموعہ ہے، مخلوقات میں اختلاف اور تنوع ہے۔ انسانوں کی تخلیق میں بھی اختلاف اور تنوع موجود ہے، رنگ و زبان اور صلاحیتوں میں۔ اور انہی صلاحیتوں کے مطابق ہی اسے مکلّف بنایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اختلاف کوئی بری چیز نہیں ہے۔ انسانوں میں ان کی تخلیق کی طرح ان کے نظریات میں بھی اختلاف اور تنوع ہوتا ہے، یہ اختلاف کبھی محمود ہوتا ہے اور کبھی مذموم۔ اختلاف کا منشا حق تک پہنچنا ہو یعنی حق بات سمجھنے کے لیے اختلاف ہو جانا محمود ہے، مذموم نہیں۔

اختلاف کا دوسرا سبب انسان کی خواہشات ہیں۔ کبھی مفاد پرستی، گروہ بندی، جتھے اور برادری کے لیے ہوتا ہے، یہ مذموم ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے کئی مقامات پر اس کی مذمت کی ہے۔

جو اختلاف معرفتِ حق اور صراطِ مستقیم پانے کے لیے کیا جائے وہ قابل تحسین ہے، اس سے بہت سے امکانات اور راستے کھلتے ہیں۔ اس سے دلائل کا حصول اور علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر آدابِ اختلاف کا خیال رکھا جائے تو حق کی تلاش کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر افسوس! ہم اختلاف کرتے ہیں، تو حق کی تلاش مقصد نہیں ہوتا، بلکہ برتری، دوسرے کو نیچا دکھانے، مقابل نظریات کو باطل ثابت کرنے کے لیے اختلاف کرتے ہیں، افسوس کہ یہ طرزِ عمل اہل علم میں بھی پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے نظریات کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش

کرتے ہیں۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ ہمیں چاہیے کہ دوسروں کے نظریات کے دلائل درست ہیں، تو انہیں بلا جھجک تسلیم کریں۔

دوسرا خطاب: 'آدابِ اختلاف' از فضیلۃ الشیخ سعید مجتبیٰ سعیدی حفظہ اللہ

کسی بھی ماحول میں آرا اور تحقیق کا مختلف ہو جانا کوئی عیب کی بات نہیں، مگر اس کے کچھ تقاضے ہیں۔ انبیاے کرام علیہم السلام کے فیصلوں میں بھی اختلاف ہو جاتا تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک قضیے میں اپنے اباجان حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلے سے اختلاف کیا، مگر یہ نہیں کہا کہ ابا جی نے غلط فیصلہ کیا۔ بلکہ یوں کہا کہ "اگر میں ہوتا تو یہ فیصلہ کرتا۔"

اختلافِ تحقیق اور علم میں ہو سکتا ہے، مگر یہ اختلاف عداوت اور دشمنی نہیں ہوتا۔ اختلافات صحابہ میں بھی ہوئے۔ اُحد میں کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایک حکم سمجھنے میں سنگین غلطی بھی ہو گئی تھی، جس سے حاصل کی ہوئی فتح شکست میں بدل گئی، اس کے باوجود دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کبھی طعنے نہیں مارے کہ تمہاری وجہ سے شکست ہوئی۔ خلیفہ ثانی سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے، شور و غوغا بلند ہوا۔ فرمایا: رونے والے کی وجہ سے مرنے والے کو عذاب ہوتا ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس بات کا پتہ چلا تو فرمایا، اللہ تعالیٰ ابن خطاب پر رحم فرمائے! بات ایسے نہیں ہے، پھر اس کی وضاحت فرمائی۔

اختلاف ہمیشہ اہل علم کے درمیان ہوتا ہے۔ جاہل بے چارہ کیا اختلاف کرے گا۔ لہٰذا علما کے آداب اور احترام کا خیال رکھیں، کسی عالم کو دوٹوک کہہ دینا کہ "آپ کی بات غلط ہے۔" ایک جاہلانہ انداز ہے۔ اہل علم سے اختلاف انتہائی مؤدب پیرائے میں ہونا چاہیے۔

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ..﴾ (النساء:۵۹)

یہ آیات مقلدین پر فٹ کرنے کے لئے ہی نہیں بلکہ باہمی اختلاف میں بھی یہی طرزِ عمل مطلوب ہے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ (م ۱۹۴۸ء) نے ہمیشہ مرزا قادیانی کے متعلق یوں لکھا: "مرزا صاحب کہتے ہیں۔" جبکہ آج نوخیز علما کہتے نظر آتے ہیں: "فلاں حنفی عالم کہتا ہے۔" مخالف کو ادب سے مخاطب کرنے سے درحقیقت آپ کا احترام بڑھتا ہے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری پر قاتلانہ حملہ کرنے والا جیل چلا گیا تو آپ اس کے گھر والوں کی کفالت کرنے لگ گئے! اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے آپ کا ہم خیال ہو گیا۔

سید بدیع الدین راشدی (م ۱۹۹۶ء) جب مولانا سلطان محمود جلالپوری رحمہا اللہ (۱۹۹۵ء) کے ہاں آئے تو

محدث جلالپوری نے شاگردوں کو تلقین کی کہ مہمان کا خوب ادب کریں۔ اور عالم کا ادب یہ ہے کہ اس سے خوب مسائل دریافت کریں۔ کسی نے رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے کا مسئلہ پوچھا۔ محدث راشدی وضع الیدین ،اور محدث جلالپوری ارسال الیدین کے قائل تھے۔ محدث راشدی نے سوال کا جواب دینے سے معذرت کرلی اور کہا کہ اپنے شیخ سے دریافت فرمائیں، جبکہ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں۔

اسی طرح محدث جلالپوری بھینس کی قربانی کے قائل تھے، جبکہ حافظ عبد اللہ بہاولپوری رحمہ اللہ (م ۱۹۹۱ء) اسے درست نہیں سمجھتے تھے۔ ایک جلسہ میں جہاں شیخین موجود تھے، کسی نے حضرت بہاولپوری سے سوال کیا کہ بھینس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ تو فرمایا: دریا سے اِس طرف جائز ہے، اُس طرف نہیں (جلالپور اور بہاولپور کے درمیان دریائے ستلج ہے)۔ ہمیں بھی دوسرے علما کرام کے ساتھ ایسا ہی رویہ رکھنا چاہیے۔

تیسرا خطاب: 'ادب الخلاف' از حافظ ندیم ظہیر حفظہ اللہ

اسے یہ حق ہے، مجھ سے اختلاف کرے مگر وجود کا میرے بھی اعتراف کرے!

اہل علم کا اختلاف برا نہیں ہے۔ اختلاف کی بنیاد پر عداوت و نفرت کے رویے برے ہیں۔ اختلاف کو اگر اخلاص اور احسان کے ساتھ مرکب کرلیا جائے تو یہ باعثِ محبت بن جاتا ہے۔ اخلاص یہ ہے کہ دوسرے کی اصلاح کی تمنا ہو، تعلی اور مخالف کی تحقیر اخلاص کے منافی ہے۔ احسان یہ ہے کہ اپنے مخالف کو محسن سمجھا جائے کہ وہ آپ کی اصلاح میں کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔ اختلاف کی گنجائش ہی ختم کردینا دوریوں کا باعث ہے۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خطبہ خلافت میں فرمایا تھا: اگر میں حق سے ہٹنے لگوں تو مجھے سیدھا کردینا۔ جبکہ ہماری نفسیات ہوتی ہے کہ میری تحریر اور تقریر میں بہتری کی ضرورت نہیں. نتیجتاً اختلاف کرنے والا برا لگتا ہے۔

امام ذہبی رحمہ اللہ (م ۱۳۴۷ء) نے مخلصین کا طریقہ یہ نقل کیا ہے:

"رحم الله من أهدٰى إلي عيوبي"

"اس پر اللہ کی رحمتیں ہوں جو میرے عیوب مجھے بتائے۔"

صاحبِ مشکاۃ رحمہ اللہ نے مقدمہ میں یہ کہہ کر اختلاف کی گنجائش باقی رکھی ہے کہ

"رحم الله من إذا وقف على ذلك نبهنا عليه، وأرشدنا طريق الصواب"

وٹس ایپ گروپوں میں ہونے والی بعض بحثیں 'چونچیں لڑانے' کے زمرے میں آتی ہیں جیسے میاں بیوی شوقیہ لڑتے رہتے ہیں مگر بات وہیں پر آجاتی ہے؛ یہی ہمارا حال ہے... اختلاف کو محبت کا ذریعہ بنائیے!!

چوتھا خطاب: 'ہم مسلک جماعتوں سے ہمارا رویہ' از حافظ یوسف سراج حفظہ اللہ (سکالر پیغام ٹی وی)

بہت سے نابینا افراد کو ہاتھی سمجھانے کے لیے ہاتھی کے پاس لے جایا گیا۔ انھوں نے اسے چھو کر محسوس کیا۔ جس کا ہاتھ، ہاتھی کے جس حصے پر لگا، اس نے اسی کو ہاتھی سمجھ لیا۔ کسی نے سونڈھ، کسی نے ٹانگ، کسی نے پشت... در حقیقت وہ سبھی درست تھے۔ یہی حالت ہماری ہم مسلک دوسری جماعتوں کی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہمارا مخالف غلط بھی ہو۔ دراصل جو شخص کسی مسئلہ کو جس جہت سے دیکھتا ہے، اسی کو درست سمجھتا ہے، دوسرا شخص اسی مسئلہ کو دوسری جہت سے دیکھ رہا ہوتا ہے، جبکہ سب ہی درست ہوتے ہیں۔

ایک مقام پر پہنچنے کے کئی راستے ہو سکتے ہیں: کوئی مختصر، کوئی طویل، کوئی مشکل اور کوئی آسان۔ جب منزلِ مقصود ایک ہے تو راستوں کا اختلاف کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔

ہمیں بہت سے لوگوں سے اختلاف ہوتا ہے۔ کیا ہمیں ان کے انسان ہونے سے بھی اختلاف ہوتا ہے؟ یقیناً نہیں، تو پھر اسے انسانیت کا احترام تو دیں۔

اختلاف کرنے والی شخصیت محترم بھی تو ہو سکتی ہے۔ کیا اختلاف حفظِ مراتب کا خیال رکھنے میں مانع ہے؟! امام شافعی اور یونس صدفی رحمہما اللہ میں اختلاف تھا، مناظرہ ہوا۔ بعد میں جب دونوں ملے تو امام شافعی نے فرمایا: "یونس! کیا ہم اختلاف کے باوجود بھائیوں کی طرح نہیں رہ سکتے؟!"

اختلافِ رائے کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ داروغہ بن جائیں۔ اختلاف کیجیے مگر مخالف کی شخصیت کا اعتراف بھی تو کیجیے۔

پانچواں خطاب: 'متفقہ ایشوز پر دینی مسالک کا اتحاد' از حافظ ہشام الٰہی ظہیر حفظہ اللہ

مسالک کا بنیادی اختلاف عقیدۂ اتباعِ رسالت میں ہے، اور اس کی بنیاد پر عبادات کی ادائیگی میں ہے۔ معاملات میں تقریباً تمام متفق ہیں، مثلاً شراب، زنا، سود وغیرہ کی حرمت پر سب ہی متفق ہیں۔

کسی مسئلہ میں متفقات پر اتحاد ہو جانا چاہیے، اس کا مطلب دوسرے کے مسلک کو قبول کرنا قطعاً نہیں۔ مشترکات میں اتحاد کے ذریعے ہم اپنی بعض باتیں منوا سکتے ہیں، جیسے متحدہ مجلس عمل کے دستور میں خلفاے ثلاثہ (سیدنا ابو بکر صدیق، سیدنا عمر، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہم) پر تبرا بازی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اگر ہم یہ موقف نہ اُٹھائیں کہ "کتاب و سنت ہی اس ملک کا سپریم لاء ہے۔" تو ہماری دعوت کے تمام راستے مسدود ہو جائیں۔ کیونکہ یہی موقف ہمارے تمام مطالبات کی بنیاد ہے۔

چھٹا خطاب: حافظ ارشد محمود حفظہ اللہ (منتظم وٹس ایپ گروپ 'علمائے اہل حدیث')

حافظ صاحب نے فرمایا کہ سوشل میڈیا پر جو الحاد کی لہر چل رہی ہے، اس کا مقابلہ ہمیں کرنا ہے، اگر ہم اپنے مشائخ سے جڑ جائیں، تو اللہ تعالیٰ ضرور ہمیں کامیاب کرے گا۔

جامعہ لاہور الاسلامیہ (لاہور اسلامک یونیورسٹی) کی ایم۔فل اسناد کی تقسیم

فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر عبدالرحمٰن مدنی حفظہ اللہ نے فرمایا:

عرصہ دراز سے میری خواہش تھی کہ ایک اہل حدیث یونیورسٹی بنائی جائے جو محکمہ تعلیم سے رجسٹرڈ ہو۔ کیونکہ کوئی بھی دینی مدرسہ محکمہ تعلیم میں رجسٹرڈ نہیں ہے، اس لیے ان کی اسناد کی بھی کوئی مستند حیثیت نہیں ہے۔ میں نے LISS کے نام سے ایک ادارہ رجسٹرڈ کروایا ہے، اس کی اسناد کو حکومت قبول کرتی ہے۔ اس انسٹیٹیوٹ کا سرگودھا یونیورسٹی سے الحاق Affiliation ہے۔ تین سال کے دوران ایم فل علوم اسلامیہ کے لئے ہم نے اس میں ۷۵ طلباء کو داخل کیا جن میں سے کئی طلباء اپنے تحقیقی مقالہ جات مکمل کر کے جمع کروا چکے ہیں اور بعض کے مقالہ جات ابھی زیر تکمیل ہیں۔ حافظ ابتسام الٰہی ظہیر اور حافظ ہشام الٰہی ظہیر سمیت بہت سے اہل علم اسی ادارے سے ایم فل کر رہے ہیں۔ اور ہمارے دو طلباء کو سرگودھا یونیورسٹی سے منظور شدہ ایم فل کی ڈگری بھی جاری ہو چکی ہے۔ ایک طالب علم نے حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ کی فقاہت پر ایم فل کا تحقیقی تھیسس لکھا ہے۔ اس کے بعد LISS سے ایم فل مکمل کرنے والے دو طلباء پروفیسر عبدالرحمٰن عابد اور پروفیسر طارق محمود کو مدنی صاحب نے ایم۔فل کی ڈگری عنایت کی۔

تیسری نشست: دعوتِ دین اور عصری تقاضے

زیر صدارت: مولانا حافظ عبدالسلام بھٹوی حفظہ اللہ

مہمانانِ خصوصی: مولانا نجیب اللہ طارق، شیخ عابد الٰہی ظہیر

اذانِ عصر سے پندرہ منٹ پہلے کھانے کا وقفہ کیا گیا۔ اور علمائے کرام کو بر تکلف کھانا کھلایا گیا۔ نمازِ عصر کے بعد تیسری نشست شروع ہوئی، آغاز قاری نوید الحسن لکھوی کی تلاوت سے ہوا۔ قاری شفیق الرحمٰن زاہد (مدیر الحکمہ انٹرنیشنل) نے اس نشست کی نقابت کے فرائض انجام دیے، انہوں نے تمہیدی گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ فقہ کے دو حصے ہیں: فقہ الاحکام اور فقہ الواقع۔ ہم آٹھ سال فقہ الاحکام ہی پڑھتے ہیں اور فقہ الواقع کا شدید فقدان ہے۔ دعوت کے اسالیب،

ماحول، وسائل اور تحدیات کا علم بہت ضروری ہے۔

دعوت الی اللہ مشکل ترین کام ہے۔ محترم ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

"داعی دنیا سے وہ کام کروانا چاہتا ہے جو وہ کرنے کے لیے تیار نہیں اور وہ کام چھڑوانا چاہتا ہے جو وہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں!"

داعی کو مخاطب کی حاجات سے کماحقہ واقفیت ہونی چاہیے۔ بھوکے کو لباس کی نہیں، کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مخاطب تین طرح کے ہیں: آزاد خیال، مسلک پرست اور جہلا۔ ہر فریق کے لیے دعوت کے اسالیب اور دلائل کی نوعیت کا فرق ہے۔

پہلا خطاب: 'سوشل میڈیا کے موضوعات کی دائمی افادیت؟' از حافظ عثمان بن خالد مرجالوی

حافظ عثمان بن خالد مرجالوی وٹس ایپ گروپ علماء الدعوۃ السلفیۃ کے مرکزی منتظم ہیں۔ انہوں نے سوشل میڈیا کا تعارف پیش کرتے ہوئے موجودہ دور میں سوشل میڈیا کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے فرمایا: ہمیں سوشل میڈیا میں لکھتے ہوئے مندرجہ ذیل باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے:

- موضوع کو کتنا وقت دینا چاہیے؟
- پورے مطالعہ کے بعد رائے
- حالات کے موافق گفتگو
- کچھ عنوان دائمی ہونے چاہئیں
- تنظیمی تعصب نہیں ہونا چاہیے
- بحث مباحثہ کم سے کم ہو۔

دوسرا خطاب: 'وٹس ایپ پر علمی گروپس کے فوائد' از محترم عابد الٰہی ظہیر حفظہ اللہ

محترم عابد الٰہی ظہیر، علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کے برادرِ صغیر ہیں۔ وہی قد و قامت، وہی خوبصورت چہرہ، کھڑے ہونے کا وہی انداز، آواز میں وہی گرج اور مسلک اہل حدیث سے وہی تڑپ، جو علامہ رحمہ اللہ کا خاصہ تھا۔ فرمانے لگے: "آسمان کے نیچے مسلکِ اہلحدیث سے بڑھ کر کوئی مسلک حق نہیں ہے۔"

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۷۹ھ) کی طرف ایک قول منسوب ہے کہ اگر دو اشخاص لڑ پڑیں، تو دونوں میں سے ایک ہی کے ساتھ حق ہو گا، دوسرا لازماً غلط ہو گا۔ ایسی ہی صورت میں ارشاد ربانی ہے:

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ﴾

آپ دیکھیں کہ کتنے مسالک کے لوگ قرآن وسنت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آپ کے مسلک کی سربلندی سے آپ کا سر بھی بلند ہوگا۔

تیسرا خطاب: 'عصری فتنوں کی تردید میں اہلحدیث لٹریچر کی اہمیت' از ابو بکر قدوسی حفظہ اللہ

ابو بکر قدوسی صاحب (ڈائریکٹر مکتبہ قدوسیہ، لاہور) مولانا عبد الخالق قدوسی شہید کے بڑے بیٹے اور علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کے داماد ہیں، موصوف نے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

ایک زمانہ تھا کہ جب کسی گمراہ اور فتنہ پرور شخص کو اپنے نظریات کی ترویج کے لیے مخصوص ماحول بنانا پڑتا تھا، مگر اب سوشل میڈیا نے یہ مشکل ختم کر دی ہے۔ اب ایک شخص دس پندرہ ہزار روپے کا موبائل لیتا ہے، اور ہزاروں لوگوں سے مخاطب ہونے لگتا ہے۔

سوشل میڈیا کی دوسری کرم فرمائی یہ ہے کہ علم پیچھے رہ گیا ہے، زبان آگے نکل گئی ہے۔ مرزا جہلمی اس کی ایک مثال ہے۔ آپ کی دعوت سب سے سچی اور مضبوط دعوت ہے۔ ضرورت اب دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق لٹریچر کی ہے۔ فقط کتاب کو لٹریچر نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ وہ تمام ذرائع اور طریقے جن کے ذریعے بات دوسرے لوگوں تک پہنچتی ہے، لٹریچر ہے۔

بیس سال قبل رفع الیدین وغیرہ کے مسائل انسان کی کایا پلٹنے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ اب بات آگے نکل کر الحاد اور انکارِ حدیث وغیرہ تک پہنچ چکی ہے۔ جس طرح اکابرین نے اہل حدیث کے امتیازی مسائل پر لٹریچر لکھا، اب الحاد وغیرہ فتنوں کے خلاف اسی طرح کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ جیسے رفع الیدین وغیرہ ہمارے امتیازی مسائل ہیں، تو دفاعِ حدیث جیسے موضوعات بھی اہلحدیثوں کا ہی امتیاز ہیں۔

وٹس ایپ استعمال کرنے والے فیس بک کا اندازہ نہیں کر سکتے، فتنوں سے مقابلے کا اصل میدان وہ ہے۔ گزارش یہی ہے کہ لٹریچر کے مفہوم کو وسیع کریں، سوشل میڈیا پر لکھیں، یوٹیوب پر کلپس ریکارڈ کروائیں۔ جاوید احمد غامدی کا طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ پہلے بندے کا ذہن بناتے ہیں، اور آخر میں نفس مسئلہ پر اپنی رائے پیش کر دیتے ہیں۔

چوتھا خطاب: 'اختلاف کی وجہ: مطالعے کی کمی' از مفسر قرآن حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

شیخ محترم نے دردِ دل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ہم طالب علموں کو کہتے ہیں کہ اپنے اکابرین کی کتب کا اس حد تک مطالعہ کریں کہ آپ کو مسلک کی حقانیت اور اس کے دلائل پر مکمل عبور حاصل ہو جائے۔ اس کے دلائل یاد ہوں، اس کے بعد مخالفین کی کتب کا مطالعہ

بھی کریں۔ مطالعہ میں کمی ہو، تو ڈر ہوتا ہے کہ آدمی مخالف سے متاثر ہو جاتا ہے، اسی طرح ابتدا میں مخالفین کی کتب پڑھنے سے بھٹکنے کا اندیشہ ہے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ علماء کتابیں لکھتے ہیں مگر اُنہیں پڑھنے والا کوئی نہیں ہے۔ ناشر ہزار نسخہ بھی شائع کرے تو وہ کئی سال پڑا رہتا ہے۔ صرف مساجد کے ائمہ و خطبا حضرات ہی اگر نئی آنے والی کتاب کو خرید لیں تو یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ فتنوں کو سمجھنے کے لیے مطالعہ ضروری ہے، اس لیے سوشل میڈیا پر کم اور مطالعے پر زیادہ توجہ دیں۔

پانچواں خطاب: 'دعوت کا نبوی منہاج' از مولانا نجیب اللہ طارق حفظہ اللہ (استاذ جامعہ سلفیہ، فیصل آباد)

آج ہم دیکھتے ہیں کہ امتِ مسلمہ زوال کا شکار ہے، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا ہمارے پاس مال نہیں، علم نہیں، افرادی قوت نہیں اور دعوت نہیں ہے؟ سب کچھ ہے، تو پھر زوال کیوں؟

آج ہمارے پاس زراعت، فوج اور ایٹم بم سب کچھ ہے۔ سیرت طیبہ کا مطالعہ کرتا ہوں حیران ہوتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں تھی، اس کے باوجود کسی کے سامنے جھکے نہیں تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان میں عدل وانصاف اور صدق تھا۔ جب تک کسی قوم میں عدل، انصاف اور صدق نہیں ہوگا، وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ آیئے! یہ چیزیں اپنے اندر اور اپنی قوم میں پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

چھٹا خطاب: 'الیکٹرونک میڈیا اور اہل حدیث' از مولانا عبد المنان راسخ حفظہ اللہ

مولانا نے اس شعر سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا:

وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے　　نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!!

آج سب سے زیادہ طاقتور الیکٹرانک میڈیا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص پڑھا لکھا نہیں، اگر پڑھا لکھا ہے تو پڑھنے کا ذوق نہیں ہے، جبکہ الیکٹرانک میڈیا سب کی دسترس میں ہے، اس سے ہر ایک فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ہم مولانا ابو یحییٰ نور پوری حفظہ اللہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اُنہوں نے ایک مفتری اور کذّاب کا رڈ کیا ہے۔

اہل حدیث کی جماعت اہل تقویٰ کی جماعت ہے، تقویٰ کی وجہ سے ہی علماے کرام میڈیا پر آنا نہیں چاہتے۔ ہم مرکزی جمعیت اہل حدیث کی قیادت کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے پیغام ٹی وی جیسا تحفہ جماعت کو عطا کیا ہے۔

ساتواں خطاب: 'اختلافِ رائے اور قرونِ اولیٰ کا طرزِ عمل' از حافظ عبدالسلام بن محمد بھٹوی حفظہ اللہ

حافظ صاحب نے اپنے نام کو القابات فضیلۃ الشیخ، شیخ الحدیث والتفسیر، بقیۃ السلف وغیرہ کے ساتھ پکارنے پر ناگواری ظاہر کی اور بڑی عمدگی سے حاضرین کو سمجھایا۔ پھر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ بہر کیف ایک فتنہ ہے کہ اپنے موضوع سے متعلق مواد کی تلاش کے ساتھ ساتھ آپ کو غیر متعلق دنیا میں گھسیٹ کر لے جاتا ہے کہ آپ اس سے بچنے کے لیے اللہ کی قسم بھی اٹھائیں تب بھی بچنا مشکل ہے۔ اس کی مثال شیخ سعدی کے شعر کی مصداق ہے:

شد غلامی بہ جوی کاب آرد　　آب جوی آمد و غلام ببرد

"ایک غلام دریا سے پانی لینے گیا، اور پانی اسے بہا کر لے گیا۔"

یعنی سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کی دعوتی اہمیت وافادیت بیان کرتے اور اس کا استعمال کرتے کرتے کہیں ہم اس کے فتنوں میں ہی نہ بہہ چلیں۔ لہٰذا اپنے موضوع کہ جس کو پڑھ یا تلاش کر رہے ہیں، اس پر ہی توجہ مرکوز کریں۔ انٹرنیٹ کے فوائد بھی ہیں مثلاً تحقیق کے ذرائع اور مکتبہ شاملہ وغیرہ۔ اب تو Pdf میں قیمتی کتابیں اپلوڈ کر دی جاتی ہیں، تاہم ناشرین کی حق تلفی سے بھی بچنا چاہیے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اپنے نام کے تذکرے کے بغیر بھی اپنی تحریر کے عام ہونے کو پسند کیا کہ مقصد صرف علم کی اشاعت ہے، نہ کہ حق مصنف کی کوئی قید لگانا۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ اسی طرح میری تفسیر وغیرہ کئی ادارے بغیر استفسار کے شائع کر رہے ہیں اور مجھے اس پر مسرت واطمینان ہے۔ الحمد للہ

الغرض لائق داد وتحسین ہیں وہ اہل علم جو انٹرنیٹ کو دعوتی مقاصد اور الحاد کی سرکوبی میں عمدگی سے بطورِ آلہ استعمال کر رہے ہیں۔

آٹھواں خطاب: شیخ الحدیث حافظ عبدالغفار مدنی حفظہ اللہ

حافظ صاحب نے حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا: جن تین آدمیوں پر جہنم کی آگ بھڑکائی جائے گی، ان میں ایک ریاکار عالم بھی ہے۔ علماے کرام کو چاہئے کہ وہ دعوت دینے کے بعد مخاطب کے لیے دعا بھی کریں۔ رسول اللہ ﷺ کی یہی سنت ہے۔ مولانا اسماعیل روپڑی ہماری جماعت کے بڑے خطیب تھے، وہ رات کو جلسے میں تقریر کرتے، اور تہجد پڑھ کر جلسہ میں شریک لوگوں کے لیے دعا کرتے تھے۔

آخری بات کہتا ہوں کہ اپنی بات پیش ضرور کریں، لیکن لوگوں پر اپنی رائے ٹھونسیں نہیں۔

مولانا عبدالقدوس سلفی حفظہ اللہ کا جاوید احمد غامدی کے متعلق ایک واقعہ

مولانا عبدالقدوس سلفی نے مولانا ڈاکٹر عبدالرحمٰن مدنی کے ارشاد پر حاضرین کو ایک واقعہ سنایا کہ جب غامدی صاحب کے افکار و نظریات چھپ کر آنے لگے تو میں نے اُنھیں خط لکھا، اور پوچھا کہ آپ حدیث کو وحی مانتے ہیں، یا نہیں؟ اُنہوں نے جواب میں لکھا کہ میں حدیث کو حجت مانتا ہوں، میں نے عرض کیا حجت ایک الگ چیز ہے۔ آپ یہ وضاحت کریں کہ آپ کی نظر میں حدیث وحی ہے یا نہیں؟ تو جواب میں بار بار یہی کہتے رہے کہ میں حدیث کو حجت مانتا ہوں، اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ حدیثِ رسول کو وحی نہیں سمجھتے!! یہ خط وکتابت محدث کے ایک ۱۹۹۷ء کے شمارہ سے مکمل طور پر شائع ہو چکی ہے۔

دور دراز سے آنے والے معزز مہمانوں کی مشغولیات اور اَسفار کی وجہ سے مغرب کے وقت یہ پروگرام ختم کرنا پڑا۔ وقت کی قلت کے پیش نظر مولانا محمد رمضان سلفی (شیخ الحدیث جامعہ لاہور الاسلامیہ)، پروفیسر ڈاکٹر مزمل احسن شیخ اور ڈاکٹر نصیر احمد اختر (چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ، لاہور یونیورسٹی) کے وہاں موجود ہونے کے باوجود خطاب نہ ہو سکے۔ حاضرین ان کی نصائح سننے کی خواہش دلوں میں لئے تقریب ختم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

آخر میں بعض مکتبوں کی طرف سے علماے کرام کی خدمت میں قیمتی کتب بطورِ ہدیہ پیش کی گئیں۔ نماز مغرب میں کنونشن کے روحِ رواں ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی حفظہ اللہ نے اپنی خوبصورت اور پر سوز آواز میں قراءاتِ عشرہ میں تلاوت فرمائی، جس سے تقریب کا روح پرور اختتام ہوا۔ نماز کے بعد حاضرین دلوں میں حسین یادیں لیے اپنی اپنی منازل کو روانہ ہو گئے۔

اُستاذِ گرامی قاری نوید الحسن صاحب نے اشعار کی صورت میں علماء کنونشن کو خراجِ عقیدت پیش کیا:

علماے کرام کی آج باہمی زیارتیں — مسکراتے چہرے میٹھی میٹھی باتیں

بے لوث محبت اور پُر خلوص چاہتیں!

خوب سماں تھا، عمدہ تھے انتظامات — پُر رونق اسٹیج اور حسیں خیالات

پُر اثر، فکر انگیز تھے خطابات — سن کر ہوئے جن سے لبریز جذبات

دعائیں جو نکلیں مسرور دل سے — دیکھ کر پُر انوار روشن لمحات

سدا متحد رہیں وارثانِ انبیا — مفسرین و محدثین علما و اتقیا

یکجان ہو کر چلیں ایک جھنڈے تلے — دشمنِ اسلام جنہیں دیکھ کر جلے

بیتاب قلوب سرِ شام ہوئے منتشر — کب ہو گا پھر وصال، رہیں گے منتظر!

تبلیغ دین کے لیے مجلس التحقیق الاسلامی کی عظیم الشان

ویب سائٹس

زیر سرپرستی	زیر نگرانی	علمی معاونت	فنی معاونت
ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی	ڈاکٹر حافظ انس نضر	قاری مصطفیٰ راسخ	انجینئر محمد شاکر اعوان
ڈاکٹر حافظ حسن مدنی	ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی	قاری خضر حیات	انجینئر عمیر حسن راجہ

محدث
Mohaddis.com

محدث لائبریری
Kitabosunnat.com

محدث فتویٰ
UrduFatwa.com

محدث میگزین
Magazine.Mohaddis.com

محدث فورم
Forum.Mohaddis.com

خصوصیات

- اسلامی کتب، مضامین اور فتاویٰ کے لیے مقبول ترین اور روزانہ اپڈیٹ ہونے والی ویب سائٹس۔
- اسلامی لٹریچر اور شرعی مسائل کے لیے دنیا بھر سے ملنے والے مطالبوں کی تکمیل
- یومیہ مناسبت کے مطابق خصوصی مضامین
- تمام ویب سائٹس اردو زبان میں
- تمام ویب سائٹس پر تبصرے و جائزے اور تاثرات و شماریات کی سہولت

جاری پروگرام

محدث
Mohaddis.com
احادیث نبویہ کا عظیم ذخیرہ، ترجمہ اور تحقیق و تخریج کی سہولت کے ساتھ

محدث لائبریری
Kitabosunnat.com
- یومیہ 3 کتب کا اضافہ (PDF)
- حالات کی مناسبت سے اہم مضامین

محدث فتویٰ
UrduFatwa.com
- تمام سلفی مطبوعہ فتاویٰ جات کی اپ لوڈنگ (نئے پیش آمدہ مسائل کے فوری جوابات)

محدث میگزین
Magazine.Mohaddis.com
47 سال کے مطبوعہ تمام شمارے
(Unicode / PDF)

محدث فورم
Forum.Mohaddis.com
موضوعات: 34,261 ترسیلات: 279,857
اراکین: 4930

یومیہ 25000 وزیٹر
ہر لمحہ 3000 قارئین

مستقبل کے منصوبے

محدث یونیکوڈ لائبریری ● محدث بلڈ بنک
محدث آڈیو، ویڈیو سیکشن ● رسائل و جرائد سیکشن

ماہانہ اخراجات سوا تین لاکھ روپے

Mobile:+92 322 7222288
anasnazar99@gmail.com

مجلس التحقیق الاسلامی J-99 ماڈل ٹاؤن، لاہور

Account: kitabosunnat.com, 0093-01875659, Bank AlFalah, Urdu Bazar, Lahore Swift Code: ALFPKKA093

www.kitabosunnat.com magazine.mohaddis.com

CPL No. 49
Vol. 50 No. 3

Monthly **MUHADDIS** Lahore

35866476
35866396

عناد اور تعصب قوم کے لیے زہرِ ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں

لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر اِفہام وتفہیم اُمت کے لیے رحمت کا باعث ہے۔

علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور افکارِ انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں

لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے

لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیتِ دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالحِ دینیہ کے خلاف ہے

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین ومسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

آئین وسیاست سے بیگانہ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ **محدث** لاہور

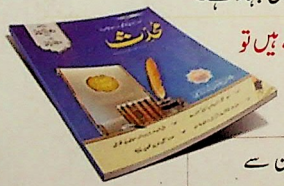

کا مطالعہ فرمایئے، آپ اس کو ان جملہ صفات ومحاسن سے مزین پائیں گے، اِن شاء اللہ!
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

- قیمت فی شمارہ ۶۰ روپے
- زرِ سالانہ ۳۰۰ روپے

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL 99-J, Model Town, Lahore 54700

Designing: AK 0321-4966404